آصفِ سابع

میر عثمان علی خاں

بچوں کے لیے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

آصف سابع

میر عثمان علی خاں

دور حکومت، شخصیت اور خدمات

(بچوں کے لیے)

طیبہ بیگم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	1999
دوسری طباعت	:	2010
تعداد	:	550
قیمت	:	-/12 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	849

Asif Sabe Mir Usman Ali Khan
Daur-e-Hukumat, Shakhsiat aur Khidmat

by

Tayyaba Begum

ISBN :978-81-7587-393-3

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی110025
فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کر سکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

اِنتساب

میرے شہر ——————

—— حیدرآباد دکن ——

—————— کے نام

○●○

فہرست

	پیش لفظ	7
1	میر عثمان علی خاں کا شاہی نسب نامہ اور سلسلہ خاندان	8
2	پرچم آصفی	9
3	میر عثمان علی خاں کے حالات زندگی	11
4	میر عثمان علی خاں کی شخصیت، اخلاق و آداب	17
5	میر عثمان علی خاں کی شاعری	21
6	ریاست حیدرآباد کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر	22
7	آصف جاہی حکومت کا قیام	25
8	دور عثمانی کا نظم و نسق	29
9	عثمان علی خاں کی تعلیمی اور علمی خدمات	34
10	اردو اور سلطنت آصف جاہی	40
11	اردو صحافت ایک مختصر جائزہ	47
12	حیدرآباد کے تاریخی آثار اور عمارتیں	48

پیش لفظ

میری کتاب " آصف سابع میر عثمان علی خاں اور ان کا عہد " ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی جس کی علمی حلقوں میں بہت پذیرائی ہوئی۔

ضرورت ہے کہ ہماری نئی نسل اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہو، خصوصاً حیدرآباد کے اس آخری فرماں روا کے بارے میں جن کا عہد قومی یکجہتی، رواداری، بھائی چارے اور گنگا جمنی تہذیب کے لیے مشہور ہے۔ سلطنتِ آصفیہ کے اس دوسوسالہ (200 years) تاریخ اور اس کی عظمت و سطوت سے واقف ہو۔ اس فقیر منش بادشاہ کی علمی، ادبی اور سماجی خدمات کو جانے جس نے اپنی زندگی اپنی رعایا کی بھلائی کے لیے وقف کردی تھی۔

پیشِ نظر کتاب " میر عثمان علی خاں " اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہے۔ ترقی اردو بیورو (موجودہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) کے سابق چیف پبلیکیشن آفیسر جناب ابوالفیض سحر نے فرمائش کی تھی کہ اپنی اس کتاب کو مختصر اور عام فہم اردو میں ہائی اسکول کے طالب علموں کے لیے دوبارہ قلم بند کروں۔ امید کرتی ہوں کہ نہ صرف طالبِ علم بلکہ عوام کے لیے بھی یہ کتاب مفید ثابت ہوگی اور پسندیدہ نظروں سے دیکھی جائے گی۔

طیبہ بیگم

میر عثمان علی خاں کا شاہی نسب نامہ اور سلسلہ خاندان

۱	نواب خواجہ عابد قلیچ خان	
۲	نواب غازی الدین فیروز جنگ	
۳	نواب میر قمرالدین خاں نظام الملک آصف جاہ اول ۱۷۲۴ء تا ۱۷۴۸ء	
۴	نواب ناصر جنگ شہید	
۵	نواب مظفر جنگ	
۶	نواب صلابت جنگ	۱۷۵۰ء تا ۱۷۶۱ء
۷	نواب میر نظام علی خاں	آصف جاہ ثانی ۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۳ء
۸	نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ	آصف جاہ ثالث ۱۸۰۳ء تا ۱۸۲۹ء
۹	نواب میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ	آصف جاہ رابع ۱۸۲۹ء تا ۱۸۵۷ء
۱۰	نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ	آصف جاہ خامس ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء
۱۱	نواب میر محبوب علی خاں نظام الملک	آصف جاہ سادس ۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء
۱۲	نواب میر عثمان علی خاں نظام الملک	آصف جاہ سابع ۱۹۱۱ء تا ۱۹۶۷ء
۱۳	نواب میر حمایت علی خاں آعظم جاہ	فرزند میر عثمان علی خاں
۱۴	نواب میر شجاعت علی خاں معظم جاہ	" " " "
۱۵	نواب میر برکت علی خاں مکرم جاہ	فرزند آعظم جاہ
۱۶	نواب میر کرامت علی خاں مفخم جاہ	" " "
۱۷	نواب شہامت جاہ	فرزند معظم جاہ
۱۸	نواب میر عظمت علی خاں	فرزند مکرم جاہ

۱۹ نواب میر رفعت علی خاں فرزند معظم جاہ

۲۰ نواب میر فرحت علی خاں " "

سلطنت کے آخری فرماں روا نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع تھے جنھوں نے ۲۴ / فروری ۱۹۶۷ء کو کنگ کوٹھی میں وفات پائی۔

پرچمِ آصفی

ایک روایت برسوں سے حیدرآباد میں مشہور ہے کہ آصف جاہ اول میر قمرالدین صوفی حضرت نظام الدین قطبِ دکن کے مرید تھے۔ ایک مرتبہ حضرت کی باریابی حاصل کرنے اس وقت ان کے آستانے پر پہنچے جب وہ کھانا کھارہے تھے۔ حضرت نے آصف جاہ کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بیٹھنے اور کھانا کھانے پر اصرار کیا۔ آصف جاہ انکار نہ کرسکے۔ دسترخوان پر کلچے رکھے تھے۔ آصف جاہ نے دو تین کلچے کھاکر ہاتھ روک لیے۔ حضرت نے کہا جس قدر چاہے کھالو چناں چہ اصرار پر انھوں نے سات کلچے کھائے اور کہا کہ اور نہیں کھائے جاتے۔

حضرت نے کہا۔۔۔ "تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ تم اور تمھاری اولاد سات پیڑی تک دکن پر حکومت کرے گی۔"

حضرت کی یہ پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ ۲۲۴ سال تک آصف جاہی بادشاہوں نے سلطنتِ حیدرآباد پر حکمرانی کی۔ میر عثمان علی خاں ساتویں نظام تھے جنھوں نے حیدرآباد پر ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۸ء تک حکومت کی اور جدید حیدرآباد کے معمار کہلائے۔

آصفی پرچم پر اسس واقعہ کی یادگار کے طور پر درمیان میں کلچے کا نشان بنایا گیا تھا۔

ایک اور روایت ہے کہ ایک بزرگ نے نظام الملک کو سات (۷) روٹیاں زرد شال میں لپیٹ کر بہ طور زادِ راہ عنایت کیں اور پیشین گوئی کہ ان کا خاندان سات (۷) پشتوں تک دکن پر بادشاہت کرے گا۔ بعض مورخین نے بزرگ کا نام نظام الدین قطب دکن اورنگ آبادی بتایا اور بعض نے شاہ عنایت جن کا وصال ۱۷۰۶ء میں ہوا۔ (حوالہ عظیم الدین محبت۔ مملکت آصفیہ۔ ص: ۳۳۹) شاید ان بزرگ کے نام سے ہی حیدرآباد کا ایک محلہ " شاہ عنایت گنج " کے نام سے مشہور ہوا ہے۔

محمد اشرف انجنیر کے بیان کے مطابق ایک بار حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہیؒ کے آستانے پر نظام الملک نے حاضری دی۔ سجادہ نشین نے رواج کے مطابق سر پر زرد رنگ کی پگڑی باندھی۔ آصف جاہ نے اعلانِ خود مختاری کے بعد عقیدت کے طور پر اسی زرد رنگ کو اپنے پرچم، اپنی دستار اور عماری (ہاتھی کے ہودج) کے لیے مقرر کیا۔ درمیان میں روٹی کا نشان بنوایا جو اس کلچے کی یادگار تھا جسے انھوں نے بزرگ شاہ عنایت کے گھر تناول کیا تھا۔ پرچم پر سبز اور سفید دھاریاں بنیں اور درمیان میں دائرہ اور دائرے کے اوپر آصف جاہی دستار جس کے اوپر " العظمت للہ " لکھا ہوا تھا۔ میر محبوب علی خاں کے عہد میں نیچے " یا محبوب " لکھا ہوتا تھا اور میر عثمان علی خاں کے عہد میں نیچے " یا عثمان "۔

لیکن عبدالمجید صاحب شعبۂ سیاسیات جامعہ عثمانیہ کے بیان کے بہ موجب درویش بزرگ کے کلچے کی یاد میں سفید دائرہ نہیں بنایا گیا تھا بلکہ یہ چاند کا عکس ظاہر کرتا تھا۔ نظام الملک کا نام قمرالدین تھا اور اسی مناسبت سے قمر یعنی

چاند کی تصویر اس پر بنائی گئی تھی۔

پرچمِ آصفی ۱۷ / ستمبر ۱۹۴۸ء تک آصف جاہی مملکت کا نشان بنا رہا۔ ۱۹۴۸ء میں سلطنت حیدرآباد انڈین یونین میں ضم کرلی گئی اور نظام ہفتم میر عثمان علی خاں کو راج پرمکھ کی حیثیت سے برائے نام برقرار رکھا گیا۔ آصفی پرچم کی جگہ انڈین یونین کا جھنڈا لہراتا نظر آیا۔

جب میر عثمان علی خاں تاج دارِ دکن نے ایک مجبور و لاچار انسان کی طرح کنگ کوٹھی میں وفات پائی تو یہی پرچمِ آصفی ان کی جسدِ خاکی سے لپٹا ہوا تھا۔

○●○

میر عثمان علی خاں کے حالاتِ زندگی

۱ **ولادت** : رعایا کے محبوب بادشاہ میر محبوب علی خاں کے ہاں یکم رجب ۱۳۰۲ھ مطابق ۵ / اپریل ۱۸۸۶ء کو میر عثمان علی خاں پرانی حویلی میں پیدا ہوئے۔ ماں کا نام امۃ الزہرا تھا اور " مادرِ دکن " کے لقب سے جانی جاتی تھیں۔ ۲۴ سال کی عمر میں میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے جانشین اور ملک دکن کے ساتویں فرماں روا ہوئے۔

۲ **تعلیم و تربیت** : بسم اللہ خوانی کے بعد پانچویں سال سے تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ عربی ، فارسی ، انگریزی اور اردو کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ عربی تعلیم اور دینی تربیت کے لیے مقرر کیے گئے جو علومِ اسلامیہ کے عالم تھے۔ سید حسین بلگرامی نواب عمادالملک اور فارسی کے اہلِ زبان آغا حیدر علی شوستری فارسی زبان و ادب کی تعلیم کے لیے متعین کیے گئے۔ مسٹر ایجرٹن

انگریزی تعلیم پر مامور ہوئے ۔ فنونِ سپہ گری اور شہ سواری کے لیے سر افسرالملک منتخب کیے گئے جو افواجِ آصفیہ کے کمانڈر تھے ۔

گھر پر تعلیم مکمل کرنے پر مدرسہ عالیہ اور نظام کالج کا رخ کیا ۔

غرض ان کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی ۔

میر عثمان علی خاں بےحد ذہین اور روشن دماغ تھے ۔ عربی ، فارسی ، انگریزی اور اردو پر یکساں عبور حاصل تھا ۔ ۔ ۔ زبان اور قلم دونوں پر حاوی تھے ۔ اردو زبان کے اسلوبِ تحریر اور اندازِ بیان میں یکتا تھے ۔ شاعری آپ کو ورثے میں ملی تھی اور نظم اور نثر دونوں میں کمال حاصل تھا ۔ آپ کے اردو اور فارسی کلام کا دیوان بھی شائع ہوا ۔ عثمانؔ تخلص کرتے تھے ۔

بچپن ہی سے مخصوص شاہانہ آداب کی تربیت کے لیے اقبال یار جنگ کی اتالیقی ملی جو میر محبوب علی خاں کے بھی اتالیق رہ چکے تھے ۔ ان کے علاوہ نواب عمادالملک اور تہور جنگ بھی ان کے اتالیق اور نگران کار تھے ۔

آپ کی تربیت میں خاص لحاظ رکھا گیا تھا ۔ ہر قسم کے لہو و لعب سے دور تھے ۔ ولی عہدی کے زمانے سے ہی جہاں بینی اور جہاں بانی کے مطالعے میں مصروف رہتے تھے ۔ ہر معاملے میں غور و فکر کے بعد اپنی رائے دیتے تھے اور فرامین جاری کرتے تھے ۔ ملک کے نظم و نسق اور رعایا کی اصلاح و فلاح کے لیے کوشاں رہتے تھے ۔ آپ بلند ہمت اور فراخ حوصلہ تھے اور پُر وقار و پُر جلال شخصیت کے مالک تھے ۔

۲ **نکاح** : ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں میر عثمان علی خاں کی شادی نواب جہانگیر جنگ بہادر کی صاحب زادی اعجاز النساء سے ہوئی جو " دولھن پاشا " کے لقب سے مشہور ہوئیں ۔

۴ **اولاد** : دولھن پاشا سے آپ کو دو (۲) لڑکے میر حمایت علی خاں اعظم جاہ بہادر اور میر شجاعت علی خاں معظم جاہ بہادر پیدا ہوئے ۔ جنھیں شاعری کا ذوق تھا اور شجیع تخلص کرتے تھے ۔ ایک صاحب زادی شہزادی پاشا تھیں ۔

آصف جاہی خاندان کی وجاہت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اعظم جاہ کی شادی ترکی کے خلیفہ سلطان عبدالمجید خاں آفندی کی صاحب زادی درشہوار دردانہ بیگم اور معظم جاہ کی شادی سلطان کی حقیقی بھانجی نیلوفر فرحت بیگم سے ۱۲ / نومبر ۱۹۳۱ ء بہ مقام فرانس نہایت سادگی سے انجام پائی ۔

یکم آذر مطابق ۶ / اکتوبر ۱۹۳۳ ء کو شہ زادی درشہوار اور اعظم جاہ کے صاحب زادے اور میر عثمان علی خاں کے پوتے میر برکت علی خاں کی ولادت ہوئی ۔ دادا نے مکرم جاہ کا خطاب دیا اور اپنا جانشین مقرر کیا ۔

دوسرے پوتے میر کرامت علی خاں کو نظام نے مفخم جاہ کا خطاب دیا ۔

۵ **جانشینی** : ۴ / رمضان ۱۳۲۹ ھ مطابق ۱۹۱۱ ء میں ۲۴ سال کی عمر میں آپ میر محبوب علی خاں کے جانشین مقرر ہوئے اور آصف جاہ ہفتم آپ کا لقب ہوا اور جانشینی کا اعلان ہوا ۔ چناں چہ آپ کا عہدِ حکومت ۲۹ / اگست ۱۹۱۱ ء سے شروع ہوا ۔ بہ حیثیت حکمران آپ نے ۳۷ سال تک حیدرآباد پر حکومت کی ۔

۶ **حدودِ سلطنت** : میر عثمان علی خاں نے دکنی تہذیب کی چھاؤں میں جب اس سلطنت حیدرآباد کی باگ ڈور سنبھالی تو اس کے حدود :

شمال میں برار اور متوسط صوبہ تھا ۔

جنوب میں مدراس

مغرب میں بمبئی

اور مشرق میں مدراس اور صوبہ ء متوسط ۔ دریائے گوداوری اور کرشنا

سرزمینِ دکن کو سیراب کر رہے تھے۔

اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین اس سرزمین پر سایہ فگن تھے جن کی برکتوں کے صدقے میں حیدرآباد امن و امان، قومی یکجہتی اور الفت و محبت کا سرچشمہ بنا رہا۔ شعر و ادب اور علم و فضل سے سنورتا رہا۔

آصف سابع میر عثمان علی خاں کا ۳۰ سالہ دور مملکتِ آصفیہ کا سنہرا دور تھا۔ یہاں اردو زبان سب کی من پسند زبان تھی۔ حکومت کی سرکاری زبان بھی اردو ہی تھی۔ رواداری اس کی گھٹی میں تھی۔ بھائی چارہ اور قومی یک جہتی اس کا اصول تھا۔

حیدرآباد دکن تین حصوں پر مشتمل تھا۔ تلنگانہ، مرہٹواڑہ اور کرناٹک۔ تلنگانہ میں تلنگی اور مرہٹواڑہ میں مرہٹی بولی جاتی تھی۔ جنوب کا کچھ حصہ کرناٹک کہلاتا تھا جہاں کنڑی بولی جاتی تھی لیکن عوامی زبان اردو ہی تھی جسے سب بولتے سمجھتے، پڑھتے اور لکھتے تھے۔

مرہٹوں، تلنگوں اور کنڑوں کے علاوہ حیدرآباد میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، عرب، پٹھان، سبھی شیر و شکر ہو کر رہتے بستے تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد وزیرِ اعظم حیدرآباد تھے وینکٹ راما ریڈی کوتوال بلدہ، تاراپور والا مشیر مال، نرسنگ راؤ مہتمم سیونگ بینک اور نظامت پنڈ کی خدمات انجام دیتے تھے جو مذہبی رواداری کی زندہ مثال تھی۔

حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب، قومی یکجہتی دورِ عثمانی کا ایک قابلِ قدر ورثہ تھی۔

، **پولیس ایکشن** : ۱۷ / ستمبر ۱۹۴۸ء وہ ستم گر دن تھا جس کا شب گزیدہ سورج اپنے جلو میں سیاہی لے آیا اور گنگ کو ٹھی میں اندھیرا چھا گیا۔

مغل تہذیب کے نقوش مٹ گئے۔

آصفی پرچم سرنگوں ہوگیا۔

مسلم اقدار کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ختم ہوگیا اور حیدرآباد میں آصفی تقریباً سو سالہ اقتدار کو صفحہ ہستی سے مٹادیا گیا۔

ایک پُر عظمت انسان کو عام انسان کی طرح اپنی چار دیواری میں زندگی کے آخری ایام کس مپرسی میں گزارنے پر مجبور کردیا گیا۔

۶ **وفات اور مدفن** : بادشاہت سے محروم ہونے کے بعد آپ نے اپنے محل کنگ کوٹھی میں ۲۴ / فروری ۱۹۶۷ء کو وفات پائی اور اپنی وصیت کے مطابق محل کے قریب مسجدِ جودی کے صحن میں اپنی محترم ماں کے قدموں کے پاس دفن ہوئے۔ گوکہ آصف جاہی سلطنت کے اکثر بادشاہ اور افرادِ خاندان مکہ مسجد کے صحن میں مدفون ہیں۔

ریاست کے اس آخری تاج دار کا جنازہ کنگ کوٹھی میں لاکھوں کروڑوں عوام نے نمناک نظروں سے دیکھا۔ زندگی کے عروج و زوال کا دیدار کیا۔

ایک فقیر منش بادشاہ اپنی رعایا سے رخصت ہوکر سوئے مزار چلا جہاں پہنچ کر ایک خاکی سوائے خاک کے کچھ نہیں رہتا۔۔۔ رہے نام اللہ کا۔

حیدرآباد میں دو ہی جنازے اس صدی میں شان و شوکت سے نکلے تھے۔ ایک نواب بہادریارجنگ کا اور دوسرا حیدرآباد کے اس عاشق کا جس کا نام تھا میر عثمان علی خاں۔

۸ **راج پرمکھ** : ستمبر ۱۹۴۸ء کے پولیس ایکشن کے بعد سلطنت آصفیہ کے والی نظام ہفتم سے سارے شاہی اختیارات لے لیے گئے۔ ان کے قیمتی جواہرات اور خزانے رزروبینک آف انڈیا کو منتقل کردیے گئے۔ ایک عام آدمی کی طرح ان پر انکم ٹیکس دولت ٹیکس اور سوپر ٹیکس لازم کردیے گئے۔ ایک آزاد مملکت کے

آزاد حکمران کو ۱۹۵۰ء میں "راج پرمکھ" کی حیثیت سے برائے نام برقرار رکھا گیا۔

یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو آندھرا پردیش کا قیام عمل میں آیا تو حیدرآباد کو اس کا دارالسلطنت مقرر کیا گیا اور نظام ہفتم کو راج پرمکھ کے عہدے سے سبک دوش کر کے انھیں گورنری کی پیش کش کی جسے نظام نے قبول نہیں کیا۔

دولت و اقتدار سے محروم اس بادشاہ بے تاج نے ۱۴ برس تک گوشہ نشینی کی زندگی گزاری، خانہ زادوں کی پرورش کرتے رہے اور شاعری کو اپنا ہم نشین و غمگسار بنایا۔ آخر ۱۹۶۷ء میں اس جہانِ فانی کو خیرباد کہہ دیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ گولکنڈہ کے آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ نے بھی دولت آباد میں نظر بندی کے دن گزارے۔

آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر نے بھی رنگون میں اسی حالت میں زندگی تمام کی۔

زمانے کے رنگ روپ بدل گئے لیکن حیدرآباد کی اہمیت برقرار رہی۔

ڈاکٹر آرتھر ہوپ نیویارک کے ناظم نے گزشتہ سالوں میں جب حیدرآباد کا دورہ کیا تھا تو کہا تھا "دنیا کو حیدرآباد کے متعلق مزید معلومات اور واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہ ہندستان کے افق کا درخشندہ ترین ستارہ ہے۔"

اس بیان سے ہی ہندستان میں حیدرآباد کی اہمیت، اس کے وجود اور اس کے موقف کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

آج بھی حیدرآباد کے چپے چپے پر میر عثمان علی خاں کی چھاپ ہے۔ یہاں آج بھی بوئے وفاداری ہے۔ آصف جاہی دور کی عمارتوں کی خوب صورتی اور حیدرآبادی تہذیب کے نشان باقی ہیں۔ آج بھی اردو زبان کاردباری اور تہذیبی زبان ہے۔

میر عثمان علی خاں کی شخصیت، اخلاق و آداب

میر عثمان علی خاں کی تخت نشینی یعنی ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک عہدِ عثمانی کے پُر عظمت ۳۷ سالوں میں حیدرآباد کو ہندستان بھر میں جو مقام، اہمیت شہرت اور نیک نامی حاصل رہی اور تہذیب و تمدن کا مرکز مانا گیا اس کی اصل اور سب سے بڑی وجہ خود سلطنتِ آصفیہ کے اس بلند مرتبت، روشن دل اور روشن دماغ مدبر کی اپنی شخصیت تھی۔

عثمان علی خاں نے اپنی خاندانی وجاہت، تہذیب اور شائستگی کا ہمیشہ پاس و لحاظ کیا۔ اسلامی اصول اور تعلیمات پر کاربند رہے۔ دولت و حشمت کی چوکھٹ پہ فقیری کی شان تازہ رکھی۔

اپنے بزرگوں کی عالی شان روایات کو نظر میں رکھتے ہوئے حال کو لائقِ تقلید بنایا اور مستقبل کو سنوارنے کی فکر میں ہمہ وقت مصروف رہے۔ اس نیک دل، ہم درد، سادگی پسند انسان نے بلندی پر پہنچ کر پستی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کی نظر ریاست کے ہر بلند و پست پر، امراء سے لے کر غربا تک پر رہتی تھی۔ عوام کی ضروریات کا انھیں پورا احساس تھا۔ انھوں نے خود کو خدمتِ خلق کے لیے وقف کردیا۔ صحیح معنوں میں انھوں نے حیدرآباد کو لائقِ رشک بنادیا۔ جب انھوں نے اپنے والد محبوبِ دکن سے تخت و تاج حاصل کیا تھا، حکومت کا خزانہ تقریباً خالی تھا اور جب خود اقتدار سے محروم ہوئے تو حیدرآباد برِ صغیر کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور خوش حال ریاست تھی۔

ڈیڑھ کروڑ رعایا کی آنکھوں نے اپنے بادشاہ کی کسر نفسی، سادگی، رواداری،

بے تعصبی اور جفاکشی کو دیکھا ۔ سبھی کو اعتراف تھا کہ عثمان علی خاں جیسا عالی دماغ، دور بین اور باوقار سلطان، سلاطینِ آصفیہ کی روایات کو زندہ رکھنے والا فرض شناس مدبر، ترقی پسند حکمران سارے خانوادہ ٔ آصفیہ میں سب سے زیادہ لائقِ احترام اور سب سے زیادہ عظیم تھا ۔

انھوں نے سلطنتِ آصفیہ کے وقار و عظمت، اقتدار اور نیک نامی اور عوام کی خوش حالی کے لیے دولت جمع کی اور ہمیشہ اسے عوام ہی کی امانت سمجھا ۔ لاکھوں کروڑوں روپے ملک و ملت کی بھلائی کے لیے صرف کردیے لیکن خود اپنی ذات کے لیے انھوں نے فقیرانہ زندگی ہی کو منتخب کیا ۔ اپنی بے مثال شخصیت سے دوسروں کی زندگی کو سادہ اور پاکیزہ بنانے کی کوشش کی ۔ ملک اور رعایا کو سیدھے سادے مگر سچے اسلامی اصولوں پر چلنے کی راہ بتائی ۔ بُرے رسم و رواج توہمات، لہو ولعب اور فضول خرچیوں سے دور رہنے کی ترغیب دی ۔ ہر کام میں کفایت اور باقاعدگی کو ملحوظ رکھنے کی تعلیم دی ۔

بلالحاظ مذہب و ملت انھوں نے عوام کی خدمت کو اپنا مقصد بنایا ۔ ان کی باخبری کا یہ عالم تھا کہ شہر کے ہر چھوٹے بڑے فقیر و رئیس کی حالت سے وہ باخبر تھے ۔ غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے ۔ ان کے لیے وظیفے جاری کرتے ۔ رعایا کی مدد کے لیے انھوں نے مختلف ٹرسٹ قائم کیے تاکہ محتاجوں اور بے سہاروں کی مدد کی جاسکے ۔ تعلیمی وظائف دے کر انھیں سماج میں اونچا اٹھنے اور ذمہ دار شہری بنانے کی کوشش کی ۔ بادشاہ کی فیاضی اور بے تعصبی کی وجہ سے ان کی رعایا اپنے غریب پرور بادشاہ کی جاں نثار تھی ۔

وہ ہر قوم کی عزت کرتے تھے ۔ ہر مذہب کی عبادت گاہوں کا احترام کرتے تھے ۔ مندر، مسجد، کلیسائیں، گردوارے، گرجا، آتش کدے، دھرم شالے،

درگاہیں سب کو حکومت کی جانب سے امداد دی جاتی تھی ۔ حیدرآباد ہی میں نہیں حیدرآباد کے باہر بھی ان کا فیض عام تھا ۔ گولڈن ٹمپل (Golden Temple) امرتسر کے لیے آپ نے ایک Canopy عطا کی جس میں ہیرے جواہرات جڑے تھے اور کلیساؤں کے لیے فانوس مرحمت کیے۔ ہندستان کے باہر کئی اداروں ، اسکولوں ، کالجوں اور ملی کاموں کے لیے کروڑوں کی امداد دی ۔ لیکن خود قناعت پسند رہے ۔ لباس معمولی ہوتا ۔ شاہوں کے شاہ تھے لیکن درویش صفت ۔ مذہبی تقاریب کے موقعوں پر اپنی رعایا کو مبارک بادی بھجواتے اور ان کی خوشیوں میں شریک ہوتے خواہ وہ عید ہو کہ نوروز ، کرسمس ہو کہ دیوالی ، یا گرونانک کا جنم دن ۔ وہ ہندو مسلم بھائی چارے کے علم بردار تھے اور انھیں اپنی دو آنکھیں کہتے تھے لیکن اپنے مذہب کے پیرو تھے اور نماز باقاعدگی سے پڑھتے تھے ۔

انسانی ہمدردی ان کی شخصیت کا نمایاں وصف تھا ۔ انسانیت اور انکساری کو اہمیت دیتے تھے ۔ ان کی سیرت و کردار ، اخلاق و آداب ، بلند ہمتی اور غم گساری ان کی شخصیت و سیرت کے نمایاں پہلو تھے ۔

اسلامی کلچر پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ دینیات ، اسلامیات ، علومِ عربی سے واقفیت کی بنا پر وہ ہر علم کے متعلق مبصرانہ رائے پیش کرسکتے تھے ۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا ۔

حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب ، ہم آہنگی اور یک جہتی ، رواداری خلوص و محبت کا ناقابلِ فراموش ورثہ عثمان علی خاں کی محترم ذات میں ہم نے بہ درجہ اتم پایا ۔

وہ اپنی ماں کے پرستار تھے اور سعادت مند بیٹے تھے ۔ ایک شفیق باپ تھے ۔ امورِ سلطنت کے فرائض کے ساتھ فرائض پدری سے منہ نہ پھیرتے تھے ۔ بچوں کو خودداری ، اعتماد اور ضبطِ نفس جیسی خوبیوں کی تعلیم دیتے کہ وہ اپنا مقام اور مرتبہ

کو پہچانیں اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں ۔ شان و شوکت سے دور رہنے کی تلقین کرتے ۔ اپنی مثال سے ان کی دینی اور اخلاقی تربیت کرتے ۔ اپنے ساتھ جمعہ کی نماز میں ضرور شریک رکھتے ۔ مذہبی تقاریب میں بھی شامل کرتے اور ان میں غرور و تکبر ،شان اور اکڑ پیدا نہ ہونے دیتے بلکہ سادہ زندگی ،انسانیت اور انکساری پر زور دیتے ۔ اپنی بیوی کی عزت کرتے تھے ۔

کنگ کوٹھی کے ملازموں سے ان کا سلوک ہمدردانہ ہوتا اور ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے ۔ اپنا ذاتی کام خود کرتے تھے ۔

سلطنت کے مختلف امور سے وہ واقف تھے ۔ ہر شعبے اور محکمے کے کام پر بہ ذات خود نظر رکھتے اور جہاں ضرورت ہوتی اصلاح کرتے تھے ۔ وقت کی پابندی ان کی بیش بہا صفت تھی ۔

اکثر درخواستوں پر جو پیشی میں گزاری جاتیں ،اپنے ہی قلم سے رائے تحریر کرتے ۔ خطوں کے جواب بھی خود ہی دیا کرتے تھے ۔ عام شاہانہ دستور کے مطابق کسی منشی سے نہیں لکھواتے تھے ۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں ۔ ایک تو یہ کہ ان کی تحریر ذاتی ہوتی اور دوسری یہ کہ ان کی رائے ہر معاملے سے ان کی باخبری کا پتہ دیتی ۔ وہ تمام امور میں عدل و انصاف سے کام لینا پسند کرتے تھے ۔

ان کی غذا نہایت معمولی ہوتی لیکن اپنے وابستگان اور مہمانوں کی دعوتوں کا عمدہ اہتمام کرتے تھے ۔ ہر روز چند امراء کے پاس خاصے کے خوان بھیجے جاتے ۔

بادشاہ کو جانوروں سے بھی بہت ہمدردی تھی ۔ کسی جانور کی تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے ۔ قصہ مشہور ہے کہ ایک بار معظم جاہی مارکٹ کے قریب سواری شاہانہ سے ایک بکری ٹکرا گئی ۔ انھوں نے فوراً موٹر روک لیا ۔ زخمی بکری کو موٹر میں ڈال کر کوٹھی لے آئے اور علاج کروایا ۔ مدت تک یہ بکری ان کی شہ نشین سے

قریب بندھی رہتی تھی۔ حیوانات کی نگہہ داشت کے لیے محکمہ " انسداد بے رحمی بر جانوران " قائم کیا اور علاج کے لیے دواخانے کھولے۔

○●○

میر عثمان علی خاں کی شاعری

میر عثمان علی خاں کو شاعری اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی۔ حیدر آباد کے علمی، ادبی اور شعر و شاعری کے ماحول میں عثمان علی خاں نے بھی شاعری میں اپنا نام روشن کیا۔ عثمان تخلص کرتے تھے، اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ جلیل مانک پوری جنھیں فصاحت جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا، استاد شاہ تھے۔ کلام شاہانہ مقامی اخباروں میں " کلام الملوک ملوک الکلام " کے تحت شائع ہوتا تھا جن پر رائے استاد جلیل " واہ کیا خوب غزل ہے " درج ہوتا تھا۔

میر عثمان علی خاں کے فارسی، اردو اور ہندی کلام کے نمونوں کو انتخابِ کلامِ آصف سابع " کے نام سے فصاحت جنگ جلیل نے مرتب کیا ہے۔

بادشاہ کی شاعری کا رنگ سادہ، مضمون صاف ہوتا تھا۔ فارسی اور اردو شاعری میں سبھی اصنافِ سخن پائے جاتے تھے جیسے حمد، نعت، منقبت، سلام، قصیدہ، مرثیہ، نظم و قطعہ اور رباعی۔ ان کی غزلیں عام فہم ہوتیں اور خیالات میں بلندی اور پاکیزگی ملتی ہے۔

ان کی ایک دعائیہ نظم جو غزل کی صورت میں تھی، تمام اسکولوں میں بہ طور ترانہ پڑھی جاتی تھی۔

تا ابد خالقِ عالم یہ ریاست رکھے
تجھ کو عثمان بصد اجلال سلامت رکھے

ان کی ایک اور غزل حیدرآباد کے ہر گائک اور گائکہ نے گائی ہے :

شبِ دوشین کی بدمستیاں میں کیا کہوں ساقی
نکل آیا ہے دن اور ہے ابھی خواب گراں باقی
زبانِ شمع سے سنتا ہوں قصہ سوزِ الفت کا
شب آخر ہو گئی لیکن ابھی ہے داستاں باقی
گل و ریحان و سنبل سب خزاں میں ہوگئے رخصت
مگر بلبل کے لب پہ رہ گئی آہ و فغاں باقی
سراغ آخر کو مل ہی جائے گا یارانِ رفتہ کا
غنیمت ہے جو اب تک ہے نشانِ کارواں باقی
سلاطین سلف سب ہوگئے نذرِ اجل عثماں
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

○●○

ریاستِ حیدرآباد کا سیاسی ، سماجی اور تہذیبی پس منظر

ریاستِ حیدرآباد دکن میں قائم تھی جس کا پایہ ، تخت حیدرآباد دکن تھا ۔ اس ریاست کی بنیاد کیسے پڑی اس کے لیے ماضی کے اوراق الٹنے ہوں گے ۔ انگریزوں نے جب ۱۸۵۷ کی فیصلہ کن سیاسی کش مکش یعنی جنگ آزادی

یا غدر کے بعد اپنی حکومت ہندستان میں قائم کی تو چند دیسی ریاستوں کو بھی خاص خاص شرائط کے ساتھ باقی رکھا۔ یہ دیسی ریاستیں ہندستان بھر میں مختلف علاقوں میں واقع تھیں۔ ان ریاستوں میں سب سے بڑی اور اہم ریاست حیدر آباد دکن کی تھی جس پر آصف جاہی خاندان حکمران تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ یہاں فوج، سکہ، ٹپہ اور ریلوے نظام ریاست ہی کے زیرِ انتظام تھے۔

سیاسی پس منظر: دکنی سلطنتوں کے قدیم دور میں جو خاندان حکمران رہے ان میں مشہور خاندان آندھرا، چالوکیہ، راشٹراکٹ، کاکتیا اور ہوئے سلا تھے۔ ان خاندانوں کی ریاستوں کی سرحدیں مختلف زمانوں میں بدلتی رہیں۔

جب شمال میں ترک خاندانوں کی حکومت قائم ہوئی تو دکن میں انھوں نے سرحدیں پھیلانے کی کوشش کی مگر دکن ہر بار شمال کی حکومتوں کے خلاف اپنی آزاد سلطنتیں قائم کرتا رہا چناں چہ سلطان محمد تغلق نے اپنے دور میں دکن میں دیوگری (دولت آباد) کو اپنا جنوبی پایہ، تخت بنانا چاہا اور بڑے پیمانے پر دہلی اور اطراف دہلی کی آبادی دکن منتقل ہوئی۔ فوجوں میں ترک، حبشی، روہیلے، پٹھان اور راجپوت کثرت سے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ صوفیا اور اولیاء نے بھی یہاں اپنی خانقاہیں آباد کیں۔

جب شمال میں حکومتیں کمزور ہوئیں تو دکن میں علاء الدین حسن گنگو بہمنی نے ۱۳۴۷ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور گلبرگہ کو اپنا پایہ، تخت قرار دیا۔ بہمنی سلطنت کے زمانے میں دکن کے تعلقات ایرانیوں سے بڑھے اس لیے آج بھی حیدر آباد میں قدیم ایرانی خاندان موجود ہیں۔ "ایرانی گلی" آج بھی یہاں مشہور ہے۔

جب بہمنی سلطنت کی بنیادیں ہلنے لگیں تو اس کے صوبہ داروں نے علیحدہ علیحدہ خود مختاری کا اعلان کرنا شروع کیا چناں چہ بہمنی سلطنت کے ٹوٹنے پر پانچ

سلطنتیں قائم ہوئیں یعنی بیدر میں برید شاہی، برار میں عماد شاہی، احمد نگر میں نظام شاہی، بیجاپور میں عادل شاہی اور گولکنڈے میں قطب شاہی۔

اس میں پہلی تین سلطنتیں مغلوں کی فوج کشی کی وجہ سے جلد ختم ہوگئیں لیکن بیجاپور اور گولکنڈے نے بہت عرصے تک ان کا مقابلہ کیا۔ عبرت کی بات یہ ہے کہ مغلوں نے انھیں حاصل کرنے کے لیے بہت نقصان اٹھائے جس میں سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ خود ان کی اپنی سلطنت کمزور ہوگئی اور دکن کے قبضے کے بعد ہی گویا مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔

نادر شاہ ایرانی کے حملوں کے بعد دلی میں بڑی افراتفری مچی اور مرکز کے کمزور ہوجانے کی وجہ سے صوبے دار بھی اپنی اپنی جگہ خود مختار بن گئے۔ ان ہی میں سے ایک نے دکنی ریاست کی بنیاد رکھی اور یوں آصف جاہی دور کا آغاز ہوا۔

نادر شاہ کے حملے کے وقت قتلِ عام کو روکنے کے لیے مغل صوبہ دار ترک قمرالدین چیں قلیچ خاں نے کہا تھا:

کسے نہ ماند کہ او را بہ تیغِ ناز کُشی	مگر کہ زندہ کُنی خلق را و باز کُشی

یعنی کوئی باقی نہیں رہا کہ تو اپنی ناز کی تلوار سے اسے ہلاک کرے مگر یہ کہ مقتولوں کو پھر زندہ کرے اور پھر ہلاک کرے۔

یہ سن کر نادر شاہ نے تلوار نیام میں رکھ لی اور یوں ظلم کا خاتمہ ہوا۔

مغلوں کی فوجیں طویل عرصہ تک دکن میں قیام پذیر رہیں۔ اورنگ زیب کے زمانے کا ایک دوہا مشہور ہے کہ کسی فوجی کی بیوی نے کہا:

سونا لادن پی گئے اور سُونا کر گئے دیس
سونا ملا نہ پی ملے اجرے بھئے سب کیس

یعنی میرا شوہر سونا لانے گیا اور سارا گھر سُونا کر گیا لیکن نہ سونا ہاتھ آیا نہ شوہر

واپس آیا۔ انتظار میں میرے سب بال سفید ہوگئے۔

سماجی اور تہذیبی پس منظر : ریاست حیدرآباد کی آبادی میں تلنگی، مرہٹی اور کنڑی بولنے والوں کے علاوہ اردو جاننے اور بولنے والوں کی خاصی تعداد تھی۔ ان مقامی لوگوں کے علاوہ حیدرآباد کے موسم، روزگار اور تہذیب کی وجہ سے ہر کسی کا دل ادھر کھنچتا رہا چناں چہ دوسرے علاقوں کے لوگ مسلسل یہاں آکر آباد ہوتے رہے۔ جو روزگار کی تلاش میں آتے وہ یہیں کے ہوکر رہ جاتے اور ایک دو نسلوں کے بعد اپنے آپ کو اسی ریاست کے باشندے کہلانے پر فخر محسوس کرتے۔ یہ باہر سے آنے والے یہاں کی آبادی میں گھل مل تو جاتے لیکن اپنی ذاتی اور علاقائی خصوصیات بھی ان کے ساتھ آتیں اور یہاں کی تہذیب کا جزُ بن جاتیں۔ اسی لیے حیدرآباد کی تہذیب میں رنگا رنگی ہے۔

○●○

آصف جاہی حکومت کا قیام

دکن میں آصف جاہی سلطنت کی بنیاد نواب قمرالدین نظام الملک آصف جاہ اول نے ڈالی جنھیں مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے چین قلیج خاں کا خطاب دیا تھا۔ ان کے دادا خواجہ عابد شاہ جہاں کے عہد میں ہندستان آئے اور مغل سلطنت میں کارگزار رہے۔ خواجہ عابد کے فرزند شہاب الدین نے اورنگ زیب کی ملازمت کی اور اس قدر شہرت پائی کہ انھیں " فرزندِ دلبند " کا لقب دیا گیا۔ ان ہی کا خطاب غازی الدین فیروز جنگ تھا جن کی شادی شاہ جہاں کے وزیرِ اعظم نواب اسداللہ خاں کی لڑکی سعید النساء سے ہوئی۔ دہلی میں ان کے نام سے ایک مدرسہ

اب بھی قائم ہے۔

مغل سلطنت کے آخری دور میں شاہ عالم نے غازی الدین کو "خانِ دوراں بہادر" اور فرخ سیر نے "نظام الملک فتح جنگ" کا خطاب دیا تھا اور دکن کی صوبہ داری پر مامور کیا تھا۔

حیدرآباد ریاست کے مورث اعلیٰ نواب قمرالدین نظام الملک آصف جاہ ان ہی غازی الدین فیروز جنگ کے بیٹے تھے۔

جس وقت دلی کی سلطنت افراتفری کا شکار ہوئی تو قمرالدین خاں نے، جو پہلے بیجاپور کے صوبہ دار تھے، دکن کی صوبہ داری حاصل کرلی اور سلطنتِ مغلیہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو برقرار رکھتے ہوئے، اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔

قمرالدین آصف جاہ اول سے ہی آصف جاہی خاندان کا سلسلہ چلا جس میں سات آصف جاہی بادشاہ ہوئے۔ قمرالدین خاں نے ۲۰ سال تک دکن میں حکومت کی اور جب انتقال کیا تو دکن کے بیشتر حصے پر ان کا قبضہ ہوچکا تھا۔

سات شاہانِ آصفیہ کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱ نواب میر قمرالدین خاں نظام الملک آصف جاہ اول
۲ نواب میر نظام علی خاں نظام الملک آصف جاہ دوم
۳ نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ نظام الملک آصف جاہ سوم
۴ نواب میر فرخندہ علی خاں ناصرالدولہ نظام الملک آصف جاہ رابع
۵ نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ نظام الملک آصف جاہ خامس
۶ نواب میر محبوب علی خاں نظام الملک آصف جاہ سادس
۷ نواب میر عثمان علی خاں نظام الملک آصف جاہ سابع

یہی ساتویں بادشاہ آصف سابع میر عثمان علی خاں ہماری کتاب کے

عنوان ہیں۔

میر عثمان علی خاں کے والد نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس بہت کم سنی میں تخت نشین ہوئے تھے چناں چہ ان کے وزیرِ اعلیٰ اور امیرِ پائیگاہ میر رشیدالدین خاں سر آسمان جاہ نے نہایت وفاداری سے سلطنت کا کام سنبھالا اور بادشاہ کے سنِ شعور پہنچنے پر سلطنت کی باگ ڈور ان کے حوالے کردی۔

میر محبوب علی خاں ایک درویش صفت بادشاہ تھے اور سخاوت میں اپنے وقت کے حاکم تھے۔ رعایا کی دل دہی اور دل داری میں ہمیشہ مشغول رہتے تھے۔ ان کے بارے میں حیدرآباد کے بڑے بوڑھوں میں عجیب و غریب قصے مشہور تھے جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نام ہی کے نہیں سچ مچ کے محبوب بادشاہ تھے۔

قصہ مشہور ہے کہ راتوں میں بھیس بدل کر وہ رعایا کا حال معلوم کرتے تھے۔ غریبوں مزدوروں کا کھانا خود کھاتے اور اپنا توشہ انھیں دے دیتے اس تاکید کے ساتھ کہ گھر جاکر کھولیں۔ توشہ کھولا جاتا تو اس میں اشرفیاں برآمد ہوتیں۔

رفاہِ عام کی خاطر انھوں نے سانپ کا عمل بھی سیکھا۔ ان کے نام کی دہائی سے سخت سے سخت زہریلے سانپ کے کاٹے کا اثر زائل ہوجاتا۔ سانپ کے ڈسے لوگوں کو عام اجازت تھی کہ وہ کسی وقت بھی آکر انھیں خبر کرسکتے تھے۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ میر محبوب علی خاں کے زمانے میں "احدیوں" کے لیے کھچڑی کھٹے کا لنگر خانہ کھولا گیا تھا۔ یہ احدی کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ دن بھر مکہ مسجد اور چارمینار میں پڑے رہتے تھے۔ میر محبوب علی خاں ان کی پرورش کرتے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کی دو وجوہات تھیں۔

یہ ناکارہ لوگ جس جگہ جاتے اپنی کاہلی کی بنا پر کام خراب کردیتے۔ اس لیے ان کو کارکرد لوگوں سے الگ کرنا ضروری تھا۔

۲ جب یہ آنکھیں بند کیے لیٹے رہتے تو آتے جاتے لوگوں کی باتیں سنتے رہتے جس سے معلوم ہوتا کہ رعایا کا بادشاہ اور حکومت کے بارے میں کیا خیال ہے۔ چناں چہ یہ لوگ مخبری اور پرچہ نویسی کے کام آتے تھے جو باتیں یہ سنتے ان سے حکومتِ وقت کو مفید مطلب خبریں حاصل ہو جاتیں۔

میر محبوب علی خاں شاعر بھی تھے اور آصف تخلص کرتے تھے آپ کے عہد میں بہت سی سیاسی اصلاحیں ہوئیں۔ "سکہ محبوبیہ" جاری ہوا۔ کیبینٹ کونسل اور لیجسلیٹو کونسل کا قیام عمل میں آیا۔ شفاخانے، ٹاون ہال اور مدارس قائم ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی کی طغیانی میں ہزاروں جانیں گئیں اور لاکھوں بے سہارا ہوئے۔ نظام سادس نے اس مصیبت کے وقت اپنی رعایا کی عدیم المثال مدد فرمائی۔ شاہی محلات مصیبت زدوں کے لیے کھول دیے گئے تاکہ وہاں وہ پناہ لے سکیں۔ کھانے اور کپڑوں کے لیے لنگر خانے بٹھائے۔ دفاتر اسکولوں کو دس دن تعطیل دے دی گئی۔ ملازموں کو پیشگی تنخواہیں جاری کیں اور تباہ شدہ لوگوں کے لیے ریاست کے خزانے سے ۵۰ لاکھ کی رقم عنایت کی گئی۔

میر محبوب علی خاں فلک نما پیالیس میں مقیم تھے۔ رمضان کے مہینے میں دفعتاً آپ پر غشی طاری ہوئی۔ حکیم ڈاکٹر بلائے گئے لیکن افاقہ نہیں ہوا اور بادشاہ چل بسے۔ آپ کی سنہ رحلت ۱۹۱۱ء تھی۔

○●○

دورِ عثمانی کا نظم و نسق

میر عثمان علی خاں جدید حیدرآباد کے معمار تھے۔ یہ ایک ایسا باوقار دور تھا جو تاریخ کے اوراق سے محو نہیں ہوسکتا۔

جب آپ تخت نشین ہوئے تو ریاست کے کل امور ان پر روشن تھے چناں چہ انھوں نے اپنی دور اندیشی سے نظم و نسق میں مختلف اصلاحات کیے۔

ان کے دورِ حکومت کا سب سے نمایاں کارنامہ اردو زبان کی ترقی اور نوجوانوں کی تعلیم اور ذہنی تربیت کے لیے جامعہ، عثمانیہ کا قیام تھا۔

دوسرا بڑا کارنامہ انھوں نے عدلیہ Judiciary کو انتظامیہ Executive سے علحدہ کر کے اسے پورے اختیارات دیے۔ پہلے ریاست کے تعلقداروں کو اختیارات تھے کہ وہ کسی مقدمے پر یہ خود ہی فیصلے سناتے اور سزائیں دیتے۔ ان خرابیوں کو دور کرنے نئی خود مختار عدالتیں قائم کیں۔ جہاں رعایا کے ساتھ انصاف برتا جاتا اور صاف و پاک نظم و نسق کی بنیاد رکھی۔

چھوٹے مقدموں کے لیے عدالتِ خفیفہ، جرائم کے لیے عدالت فوجداری، مالگزاری (Revenue) اور زمینات کے مسائل کے لیے عدالت دیوانی اور بڑے مقدمات کے لیے عدالت العالیہ (High Court) قائم ہوئے۔

ایک اور بڑا کارنامہ شخصی حکومت یعنی (Monarchy) کو جمہوریت یعنی Democracy میں تبدیل کردیا اور ایک نیا محکمہ "بابِ حکومت" قائم کرکے سیاسی مدبر کا اظہار کیا۔ بابِ حکومت میں ریاست کے بڑے بڑے معاملات سب اراکین کے صلاح و مشورے سے طے پاتے اور بادشاہ کی توجہ کے لیے پیش کیے جاتے۔ اس طرح سلطنت کے کاروبار باقاعدہ اور منظم طریقے سے انجام پاتے

مے۔ بابِ حکومت میں سب مذہب و ملت کے اراکین شامل کیے گئے تھے۔

چوتھا کارنامہ شاہی خاندان کے املاک اور آمدنی خرچ پر نظر رکھنے کے لیے ایک "شعبہ" صرفِ خاص" قائم ہوا۔

دوسرا شعبہ "شعبہ دیوانی" تھا جس میں ساری ریاست کے انتظام اور آمدنی اور خرچ پر نظر رکھی جاتی تھی۔

اس کے علاوہ انھوں نے پرانے محکموں کی جگہ نئے محکمے قائم کیے تاکہ نظم و نسق کو بہتر بنایا جاسکے اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے بے شمار کام انجام پاسکیں۔

۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی کی طغیانی نے حیدرآباد میں تباہی مچادی تھی۔ چناں چہ اپنی تخت نشینی کے دو سال بعد ۱۹۱۳ء میں انھوں نے "مجلس آرائشِ بلدہ" قائم کیا۔ موسیٰ ندی پر پُل تعمیر کیے گئے۔ پرانا پل، نیا پل، چادر گھاٹ کا پل بنائے گئے۔ بعد میں سالار جنگ پل سالار جنگ کے میوزیم کے قریب ایک اور پل تعمیر کیا گیا۔

آب پاشی کے لیے چھوٹی بڑی نہریں نکالی گئیں جن میں محبوب نہر، آصف نہر، گنگاوتی نہر اور میچل نہریں تھی۔

قحط سے ریاست کو محفوظ رکھنے کے لیے بڑے بڑے تالاب جیسے عثمان ساگر (گنڈی پیٹ) اور حمایت ساگر، میر عالم تالاب اور پاکھل کے تالاب بنائے گئے اور شہریوں کو پینے کا پانی دستیاب کیا۔

آب رسانی کے لیے ہر ضلع میں نلوں اور گندے پانی کی نکاسی کے لیے ڈرینج کا انتظام ہوا۔ نظام آباد میں ایک بڑا بند نظام ساگر تیار کروایا جس سے ہزاروں ایکڑ زمین کی آب یاری ہوتی ہے۔

حیدرآباد اور سکندرآباد کے درمیان حسین ساگر تالاب (حسین شاہ ولی

کی نشانی شہر کی خوب صورتی میں اضافے کا باعث بنا۔ اسس کے ذریعے بھی عوام کو پینے کے پانی کا انتظام کیا گیا۔

قدیم تنگ و تاریک مکانات کو منہدم کر کے جدید مکانات تعمیر کروائے گئے جہاں حفظانِ صحت کا پورا خیال رکھا گیا اور بچوں کے لیے کھیل کود کے میدان اور جسمانی ورزش گاہیں قائم کیں۔

محکمہ آثار قدیمہ کے تحت تاریخی عمارتوں کی مرمت اور دیکھ بھال کی گئی۔ اجنٹہ ایلورا کے غاروں کی صفائی اور قدیم فنِ نقاشی کو زندگی بخشی۔ مختلف دور کے مندر، مسجد، درگاہیں، مدرسے، دولت آباد کا قلعہ، بی بی کا مقبرہ سلاطینِ گولکنڈہ کے شاہی مقبرے، مکہ مسجد، چارمینار، غرض تاریخ کی ساری پُر عظمت عمارتوں کو جاوداں کر دیا۔

عجائب خانے اور باغوں کو عوام کے لیے کھول دیا تاکہ وہ قابلِ قدر چیزوں اور قدیم صنعتوں کا مشاہدہ کر سکیں جو ہمارے ملک کی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔

محکمہ تعمیرات کے تحت مختلف حیدرآبادی علاقوں میں سرائے بنوائے گئے۔ قابلِ ذکر خوب صورت عمارتوں میں ٹاؤن ہال، جوبلی ہال، نظام کلب، مجلسِ مقننہ، جاگیردار کالج، سٹی کالج، عثمانیہ ہائی کورٹ، عثمانیہ دواخانہ، شفاخانہ نظامیہ، کتب خانہ آصفیہ، معظم جاہی مارکٹ، مرا خانہ، زہرا، فلک نما پیالیس اور جامعہ عثمانیہ، عہدِ عثمانی کی شان دار عمارتیں ہیں۔

تنگ و تاریک گلیوں اور راستوں کو روشن اور کشادہ کیا۔ صفائی کا بہترین انتظام کیا، بجلی کا انتظام ہوا تو شہر روشنی سے جگمگا اٹھا۔ سرسبز و شاداب باغ لگائے گئے۔ سمنٹ، ڈانبر، روڑی اور پکی کی چوڑی سڑکیں بنیں اور ہر جگہ ڈرینج کا باقاعدہ انتظام ہوا۔

امورِ مذہبی کے تحت مسلمانوں ، ہندوؤں ، پارسیوں ، سکھوں اور عیسائیوں کے مذہبی مقامات کی حفاظت کی گئی اور مذہبی رواداری اور بھائی چارے کی ایسی مثال قائم کی جو کسی سلطنت میں نہیں پائی جاتی تھی

جنگلات کے محکمے کے تحت جنگلوں اور جانوروں کی نگرانی کا انتـ ہوا

محکمہ زراعت کے تحت کاشت کاروں کی تربیت کی گئی اور جدید فنی ... سے لیس کیا گیا تاکہ مختلف دھاتوں سے زمین زرخیز ہوسکے اور بہترین برآمد ہوسکے۔

صنعت و حرفت کے محکمے کے ذریعے مردہ صنعتوں کو زندہ کرنے اور مختلف دیسی صنعتوں کے فروغ کے لیے امداد دی گئی اور ہر سال صنعت و حرفت کی نمائش کا اہتمام کیا گیا اور صناعوں اور کاریگروں کی ہمت افزائی کی گئی۔

محکمہ حفظانِ صحت کی طرف سے دواخانوں کے انتظاموں کو درست کیا گیا اور علاج کے بہتر سہولتوں کے لیے نئے نئے عصری آلات مہیا کیے گئے اور مختلف طریقہ ، علاج یعنی آیورویدک ، یونانی اور انگریزی علاج کا انتظام کیا گیا۔ عثمانیہ دواخانے کے ساتھ ایک مڈیکل کالج یا طبیہ کالج کھولا گیا۔

دق کے مریضوں کے لیے پُر فضا مقامات پر Sanitoriums کھولے گئے ذہنی مریضوں کے لیے پاگل خانوں کا انتظام کیا گیا۔

خود مختار سلطنتِ آصفیہ میں اس کا اپنا سکہ رائج تھا ۔ ایک دفتر نظامت سرکار عالی ناملپلی میں قائم ہوا پھر اسے عابد روڈ میں ایک نئی کئی منزلہ عمارت میں منتقل کیا گیا۔ ٹپہ خانوں کی تعداد بڑھائی گئی جو ریاست کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔

عہد عثمانی میں سکہ ، محبوبیہ کا نقش قائم رکھ کر عثمانیہ سکے اور نوٹ

رائج ہوئے۔

محکمہ۔ لاسلکی یعنی ریڈیو اسٹیشن سرونگر میں قائم ہوا۔

پولیس کا انتظام کوتوالِ شہر کے تحت اس قدر عمدہ تھا کہ ہر جگہ امن وامان تھا۔

ریاستِ حیدر آباد میں چھوٹی بڑی پٹریوں کی ریلوں کا جال سا بچھا تھا۔ نظام اسٹیٹ ریلوے کے تحت ریلوں کی بہترین کارکردگی ہوتی تھی۔

حکیم پیٹ میں طیران گاہ یعنی Airport کا قیام عمل میں آیا۔

محکمہ سیاسیات کے تحت حیدر آباد کے تمام داخلی امور آزادانہ طور پر کام کرتے تھے۔ تمام سیاسی مسائل بادشاہ کی رائے سے تصفیہ پاتے تھے۔

غریب کسانوں کو انجمن ہائے امدادِ باہمی کے محکمے کے تحت روپیہ بطورِ قرض دیا جاتا تھا تاکہ وہ ساہوکاروں، بنیوں اور مارواڑیوں اور زمیں داروں کے پاس اپنا روپیہ رکھ کر پریشان نہ ہوں۔ اضلاع اور دیہاتوں میں اس محکمے نے کئی بینک کھولے جن میں کسان حصہ دار تھے۔

محکمہ۔ دیہی ترقیات کے تحت دیہاتوں کو پانی اور دوسری سہولتیں فراہم کی گئیں صفائی، حفظانِ صحت، ڈرینج، سڑکوں کی تعمیر اور درستی اور دیہی مدارس کی نگرانی کی گئی۔

اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے اسکول اور کالج کھولے گئے۔ ذہین طالبِ علموں کو وظیفے دے کر حیدر آباد کے باہر اعلیٰ تعلیم کے لیے بھجوانے کا انتظام کیا چناں چہ حیدر آباد کی ایک خاتون جو بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو کے نام سے یاد کی جاتی ہیں، حکومت سرکارِ عالی کی جانب سے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھجوائی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ کئی ہونہار طلبا ڈاکٹری اور دوسرے فنون کے سلسلے میں وظیفے لے کر باہر کے ممالک میں تعلیم پوری کرنے سدھارے تھے۔

اس طرح میر عثمان علی خاں نے نہ صرف تعلیمی میدان میں بلکہ حیدرآباد کے نظم و نسق میں عمدہ تبدیلیاں لاکر حیدرآباد کو ایک مثالی ریاست بنادی۔ جہاں عوام آسودہ حال تھے۔ بھائی چارہ اور یکجہتی کے ساتھ رہتے تھے۔

آپ کے دور میں 6 وائسرائے ہند حیدرآباد آئے تھے اور 56 رزیڈنٹس مقرر ہوئے تھے جن میں کرک پٹرک رزیڈنٹ نے حیدرآبادی خاتون خیرالنساء بیگم سے شادی کی تھی اور حشمت جنگ کا خطاب پایا تھا۔

عہدِ عثمانی میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد یمین السلطنت ۱۳۱۹ھ میں ریاست حیدرآباد کے وزیرِ اعظم تھے۔

سالار جنگ سوم میر یوسف علی خاں بھی ۱۳۳۰ھ میں اس منصب سے نوازے گئے تھے۔

نواب سر علی امام موتمد الملک بہادر، نواب سر فریدوں ملک بہادر نواب سعید احمد خان چھتاری، نواب سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ اور میر لائق علی بھی اس منصب پر فائز رہ چکے ہیں۔

○●○

عثمان علی خاں کی تعلیمی اور علمی خدمات

میر عثمان علی خاں ریاست حیدرآباد کے روشن اور درخشاں دور کے معمار تھے انھوں نے ہر شعبہ۔ زندگی میں حیدرآباد کو ایک مثالی ریاست بناکر ترقی دی۔ تعلیم کو عام کیا نظم و نسق اور فلاح و بہبود کے کاموں میں بہت سی اصلاحیں کیں۔ اپنی دور اندیشی کے باعث انھوں نے ریاست کو ایسا انتظامیہ

دیا کہ چند ہی دنوں میں کایا پلٹ دی۔ سیاسی، علمی اور معاشرتی ہر حیثیت سے اتنی ترقی ہوئی کہ ہندوستان کی کوئی اور ریاست حیدرآباد کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

ان کا سب سے نمایاں کارنامہ اردو زبان کی ترویج تھا۔ اردو کو فارسی کی جگہ دفتری زبان بنائی اور اردو تعلیم کو بڑے پیمانے پر رائج کرنے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ اس طرح پوری نئی نسل کو ہر طرح کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار کیا۔

جامعہ عثمانیہ : اسی علمی و ادبی سرپرستی نے جامعہ عثمانیہ کو وجود میں لایا جس کی بہ دولت تعلیم اردو زبان میں ہونے لگی۔ اردو کے ساتھ دوسری مقامی زبانوں سے غفلت نہیں برتی گئی بلکہ تمام سرکاری ملازمین اور عہدہ داروں پر یہ پابندی تھی کہ اپنی مادری زبان کے علاوہ کسی ایک مقامی زبان میں زبان دانی کا امتحان کامیاب کریں۔

گو کہ سارے علوم کی تعلیم "اردو زبان" میں دی جاتی تھی لیکن انگریزی زبان و ادب کی تعلیم بھی لازم تھی۔

جامعہ عثمانیہ کی بنیاد ۱۹۱۸ء میں رکھی گئی لیکن تعلیم کا آغاز ۱۷/ اگست ۱۹۱۹ء میں میر عثمان علی خان کے فرمان کے ذریعے ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس جامعہ میں جدید و قدیم، مغربی و مشرقی علوم و فنون کا ایسا امتزاج ہو کہ موجودہ طرزِ تعلیم کے نقائص اور کمیاں دور ہوں اور اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جائے۔ اسی طرح حیدرآباد کے باصلاحیت نوجوانوں کو آگے بڑھنے اور اونچے مراتب پانے کا موقع دیا۔ نتیجے کے طور پر طالب علموں کی پوشیدہ صلاحیتیں اجاگر ہوئیں اور وہ نہ صرف ادیب اور شاعر بن کر نکلنے لگے بلکہ دوسرے فنونِ زندگی میں مثلاً ڈاکٹری، انجینیرنگ، قانون دانی وغیرہ میں بھی نام کمایا۔

جامعہ عثمانیہ کی عمارت مغل اور ہندو آرٹ کا خوبصورت نمونہ ہے اور دنیا کی ۱۲ بہترین یونیورسٹیوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ یہاں کے اساتذہ طالبِ علموں سے اپنے بچوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ علم کا شوق اور لگن ان میں پیدا کرتے تھے چناں چہ طالب علم، علم کے ساتھ ادب، عزت و احترام کا درس بھی لیتے رہے۔

جامعہ عثمانیہ کا قیام اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے ساتھ ذہنی اور اخلاقی تربیت کا باعث ہوا اور عوام میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ ذہن بیدار ہوئے اور نئے آفاق، نئی راہیں، بنتی گئیں۔ ایک انقلاب برپا ہوا اور بیرونی ممالک کی یونیورسٹیوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کو تسلیم کرلیا۔

دار الترجمہ : جامعہ عثمانیہ کی تعلیم اس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ مختلف علوم کا اردو میں ترجمہ نہ کیا جاتا۔ کتابوں کے ترجموں کے لیے ماہرینِ فن کی ضرورت تھی جو فارسی اور اردو میں بھی ماہر ہوں اور صاحبِ قلم بھی ہوں، انگریزی اور عربی زبان سے اردو میں منتقل کرسکیں۔ چناں چہ نصابی کتابوں کی ضرورت کے پیشِ نظر ۱۹۱۷ء میں دار الترجمہ کا قیام عمل میں آیا۔ فلسفہ، ریاضی، طب، سیاسیات، معاشیات، تاریخ ہند اور قانون کی کتابوں کے سلیس اور آسان اردو زبان میں ترجمے کیے گئے۔

دائرۃ المعارف : اسلامی سرمائے کو محفوظ کرنے کے لیے دائرۃ المعارف کا قیام عمل میں آیا اور عربی زبان کے علوم و فنون کی قیمتی و نایاب کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرواکر طالبِ علموں کو تاریخِ اسلام سے واقف کرایا گیا۔ اس کے روحِ رواں نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے۔

قابلِ اشاعت کتابوں کی تحقیقات شروع ہوئیں۔ قلمی نسخے فراہم کیے

گئے اور ان کی طباعت اور اشاعت کے لیے پریس قائم کیا گیا۔

یہ ایک علمی ادارہ ہی نہیں بلکہ دنیا میں ۱۱۰ سال سے علم و فن کی خدمت کرتا چلا آرہا ہے۔ یہاں کی شائع کردہ کتابیں عرب اور اسلامی ممالک میں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔

آپ کی علم پرستی اور علم نوازی صرف اپنی ریاست تک محدود نہ تھی بلکہ حیدرآباد کے باہر بھی ان کی سخاوت مشہور تھی۔ انھوں نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی اور شانتی نکیتن اور ایسے کئی تعلیمی اداروں کو مالی امداد دی۔ کئی بیرونی ادیبوں کے لیے اپنی ریاست کے دروازے کھول دیے۔

میر عثمان علی خاں ایک علم پرور بادشاہ تھے۔ اپنی ریاست کے عوام کو جہالت اور توہم پرستی کے اندھیروں سے نکالنا چاہتے تھے۔ تنگ نظری کی جگہ روشن خیالی اور ذہنی بیداری چاہتے تھے۔ زندگی بھر انھوں نے علم کی ترقی اور سماجی بھلائی اور رعایا کی بہتری کے لیے کام کیا۔ ملک کے نونہالوں اور نوجوانوں کو علم سے روشناس کیا۔

اردو کے علاوہ ریاست کی علاقائی زبانوں تلنگی، کنڑی، مرٹھی میں بھی ابتدائی مدارس قائم کیے تاکہ مادری زبان میں بچوں کی تعلیم ہوسکے۔ آج جن اصول کا ہر طرف شہرہ ہے عثمان علی خاں نے کئی سال پہلے اس بنیادی اصول کو سمجھ لیا تھا۔

ان کی تخت نشینی سے پہلے ریاست میں بہت کم مدارس تھے۔ انھوں نے ہر شہر، ہر ضلع، تعلقہ اور قصبے میں مدارس قائم کئے۔ تعلیمِ بالغان کا بھی انتظام کیا۔ بہرے گونگے بچوں کو سماج میں اپنا مقام دلوانے انھوں نے خاص ذرائع اور آلات مہیا کیے۔ پیشہ ورانہ مدارس قائم کرکے بیکار لوگوں کو ذرائع معاش

دلوایا۔ اساتذہ کی تربیت کے لیے ٹریننگ اسکول اور کالج کھولے گئے تاکہ بچوں کی تعلیم و تربیت صحیح ڈھنگ سے ہوسکے۔ کھیل کود اور جسمانی ورزش کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی۔

جاگیرداروں کے بچے عام طور پر تعلیم کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے چنانچہ جاگیرداروں سے مقررہ رقم وصول کرکے بیگم پیٹ میں ایک جاگیردار کالج قائم کیا جو آج کل حیدرآباد پبلک اسکول میں تبدیل ہوگیا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے اداروں کے ساتھ ہوسٹل کا بھی انتظام کیا تاکہ طالب علم آدابِ نشست و برخواست بھی سیکھ سکیں۔ اضلاع کے طالب علموں کی رہائش کا بھی اس میں انتظام کیا گیا۔

شاہی خاندان کے عزیز و اقارب کی تعلیم کے لیے مدرسہ اعزہ قائم ہوا۔ مدرسہ عالیہ اور نظام کالج کھولے گئے۔ ان کی علم نوازی نے دکن کے گوشے گوشے کو علم سے بہرہ ور کردیا۔

ان تمام تعلیمی کارناموں کا اثر یہ ہوا کہ امراء اور فلاحی ادارے بھی اپنے اپنے طور پر خانگی ادارے قائم کیے۔ ممتاز یاورالدولہ نے مدرسہ، آصفیہ اور ایک ہوسٹل ملک پیٹ میں قائم کیا پھر ممتاز کالج کا قیام عمل میں آیا۔ کئی اور خانگی اور امدادی ادارے، مدارس، یتیم خانے، علمی اور ادبی انجمنیں قائم ہونے لگیں اور ریاست علم کی روشنی سے جگمگا اٹھی۔

میر عثمان علی خاں تعلیمِ نسواں کے زبردست حامی تھے۔ لڑکیوں اور خواتین کے لیے انھوں نے زنانہ اسکول اور کالج کھولے۔ لڑکیوں کو گھروں سے لانے لے جانے کے لیے پردہ دار شِکراموں اور بیل گاڑیوں کا سرکاری انتظام کیا جس کے ساتھ خادمائیں بھی ہوتی تھیں تاکہ لوگ بلاجھجک اپنی لڑکیوں کو مدرسہ بھیج سکیں۔

اس طرح سماج کے ہر طبقے کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔

جامعہ ، عثمانیہ کے قیام کے بعد اپنے علم پرور علم دوست بادشاہ کے کارناموں کو سراہتے ہوئے انھیں " سلطان العلوم " کے لقب سے موسوم کیا گیا۔

کتب خانہ ، آصفیہ : آصف جاہی سلاطین کی علم پروری کا نتیجہ تھا۔ میر محبوب علی خاں کے عہد میں عماد الملک کی نگرانی میں یہ کتب خانہ عالمِ وجود میں آیا۔ اس وقت یہ حیدر آباد کا شاہی کتب خانہ کہلاتا تھا۔ ابتدا میں اس میں اردو ، فارسی ، عربی اور انگریزی کی کتابیں اور قلمی نسخے رکھے جاتے تھے۔ اس کتب خانے نے ایسی ترقی کی کہ اس کا شمار ہندوستان کے چند مشہور کتب خانوں میں ہونے لگا۔

پہلے یہ کتب خانہ صدر ٹپہ خانہ عابد روڈ کی عمارت میں تھا۔ ۱۹۳۱ء میں موسی ندی کے کنارے سوا لاکھ روپے کی لاگت سے دو منزلہ عمارت کی تعمیر کروائی گئی جو آج شہر کے بیچوں بیچ اپنی نفاست اور خوبصورتی کی وجہ سے اپنی آپ نظیر ہے۔

اس کتب خانے کا افتتاح میر عثمان علی خان نے فرماکر اپنی علم دوستی اور علم پروری کا ثبوت دیا۔

اعزازت : میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کو ۲۴ / جنوری ۱۹۱۸ء میں جارج پنجم برطانیہ کی جانب سے " ہز اکزالٹیڈ ہائی نس HIS EXALTED HIGHNES کا اعزاز ملا تھا اور یارِ وفادار سلطنتِ برطانیہ سے موسوم کیا گیا تھا۔

مجلس رفقائے جامعہ ، عثمانیہ نے اپنے علم پرور بادشاہ کی علمی خدمات کو سراہتے ہوئے آپ کو " سلطان العلوم " کا لقب دیا۔ آپ کو حضور " بندگانِ اقدس " اور " اعلیٰ حضرت " کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔

قومی اور دینی خدمات کے سلسلے میں عوام نے آپ کو " محی الدین و محی الملت " کا لقب دیا تھا۔ ○●○

اردو اور سلطنت آصف جاہی

میر عثمان علی خاں کا دور اردو ادب و شعر کا ایک روشن مینار کہلایا جاتا ہے۔ ان کا عہد حکومت اردو کی ترویج و ترقی کے لحاظ سے گذشتہ تمام عہدوں سے ممتاز رہا ہے۔ اس فرماں روا نے اردو زبان کو اس قدر ترقی دی کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی زبان کی برابری کر سکتی ہے۔ قدیم اور جدید علوم و فنون کو اردو میں منتقل کر کے انھوں نے اردو ادب کے خزانے کو مالا مال کردیا۔

اظہارِ مطلب کا جو سلیقہ اردو میں ہے، جو شائستگی اور تہذیب اس میں ہے اس نے غیر مہذب کو بھی مہذب بنادیا۔ یہاں تک کہ ہماری تہذیب خود "اردو تہذیب" کہلانے لگی۔

جس کسی نے اردو کا دم بھرا وہ ذرے سے آفتاب بن گیا۔ اردو گیت غزل نظم مرثیے قصیدے قوالی گائکوں نے گائے، گداؤں فقیروں نے اس سے روزی کمائی اور شاعروں ادیبوں نے اردو دنیا میں دھوم مچادی۔

دبستانِ دہلی، دبستانِ لکھنو اور دبستانِ دکن ___ ہر دبستان میں اس کا حُسن اور دل نوازی دلوں کو گرماتی رہی۔

اردو زبان کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے اردو کی لسانی روایات کا ایک مختصر جائزہ ضروری ہے۔

" اردو " ترکی کا لفظ ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں۔ اردو کے لغوی معنی اصل میں " کھچڑی " کے ہیں۔ اس لشکر کو اردو کہتے ہیں جس میں مختلف علاقوں اور نسلوں کے لوگ شامل ہوں۔

محمد بن قاسم، سلطان شہاب الدین غوری اور محمود غزنوی کے زمانے

سے جب ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور ان کی سلطنتیں قائم ہوئیں تو ان کے لشکر میں فارسی، عربی اور ترکی بولنے والے سپاہی شمالی ہند کے مختلف حصوں میں پھیل گئے جن میں مختلف ہندوستانی علاقوں کے فوجی بھی شامل تھے۔ ہندوستانی باشندوں کو ان بیرونی سپاہیوں کے ساتھ تبادلۂ خیال اور لین دین کے لیے ایک ایسی بولی یا زبان کی ضرورت پڑی جو اشاروں کنایوں سے آگے بڑھے چناں چہ کچھ اپنی اور کچھ بیرونی بولیوں اور الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی زبان نے جنم لیا جو عوام کی زبان بنی جسے فارسی کے مقابلے میں "ہندوی" کا نام دیا گیا۔ ہندوی سب سے پہلے پنجاب میں رائج ہوئی۔ پھر دہلی اور آگرہ پہنچی اور شاہجہاں نے اسے اردو کا نام دیا کیوں کہ یہ اردوئے معلی کے شاہی حفاظتی دستوں کے لشکر کی زبان تھی۔ شاعروں نے ریختہ سے موسوم کیا اور پھر عام طور پر یہ اردو کے نام ہی سے جانی جانے لگی۔

اس نئی زبان میں ترکی، عربی، فارسی الفاظ متواتر شامل ہوتے گئے۔ آپسی میل جول سے نئے احساسات، نئے خیالات کی تخلیق ہوئی۔ صحت مند شعور پیدا ہوا اور نئی تہذیب و معاشرت سے ہم آہنگ ہو گئی۔ اپنی شائستگی اور صاف لب ولہجے کے باعث ہر دل عزیز ہوئی اور دھیرے دھیرے ادبی تخلیق کا باعث ہوئی۔

کہتے ہیں کہ مسعود سلمان نامی شاعر نے "ہندوی زبان" میں شاعری کی۔ مورخ انھیں اردو زبان کا پہلا شاعر تسلیم کرتے ہیں مشہور صوفی شاعر حضرت امیر خسرو ترک تھے لیکن ہندوی سے پیار کرتے تھے۔

، ویں صدی عیسوی کے اردو کلام کا بہترین نمونہ حضرت امیر خسرو کے ہندوی کلام میں ملتا ہے۔ اردو اور ہندی کی موجودہ شکلیں دراصل اسی "ہندوی" کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ انھوں نے فارسی اور ہندوی کے سلونے پن کو یکجا

کردیا اور اردو اور ہندی کے باوا آدم کہلائے۔

ماہرینِ لسانیات نے امیر خسرو کو "کھڑی بولی" کا اولین شاعر قرار دیا ہے کیوں کہ لب و لہجے کی وجہ سے اردو زبان اور ہندی کو بعض لوگ "کھڑی بولی" میں شمار کرتے ہیں۔ امیر خسرو نے منظوم پہیلیاں، انملوں، کہہ مکرنیاں، دوہے، ڈھکوسلے اور غزلیں لکھ کر اپنے کلام کو خاص و عام تک پہنچایا۔

خاندانِ غلامان، خلجی اور تغلق خاندان سے لودھیوں کے عہد تک آتے آتے تہذیبی اور لسانی سطح پر یہ زبان نئے نئے سانچوں میں ڈھل کر سنورتی گئی اور پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جانے لگی اور پھر ادبی سطح تک پہنچ گئی گو فارسی ہر زمانے میں سرکاری زبان رہی۔

تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی حالات کے تحت ہر زمانے میں یہ پروان چڑھتی رہی۔ جہاں جہاں یہ گئی وہاں وہاں علاقائی اثرات قبول کرتی گئی۔ گجرات میں گجری کہلائی اور جب دکن پہنچی تو یہاں دکنی اردو سے موسوم ہوئی۔

مختصر یہ کہ اردو زبان کی بنیاد ہندوستان ہی کی مختلف بولیاں ہیں جو شورسینی اپ بھرنش سے نکلی ہیں۔ بیرونی زبانوں سے مل کر یہ نئی زبان پیدا ہوگئی۔ اردو کی روحِ خالص ہندوستانی ہے۔ یہ نہ غیر ملکی زبان ہے اور نہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے جیسا کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے۔ اردو چوں کہ مسلمان حکمرانوں کے زیرِ سایہ پلی اور پروان چڑھی، اس میں فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔

ہندوستان میں اردو زبان کو بول چال کی سطح سے نکال کر ادبی سطح تک پہنچانے کا کام صوفیوں اور بھگتوں نے کیا۔ تبلیغِ دین کے لیے اردو زبان ہی ایسی زبان تھی جو ملک کے کونے کونے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ دکن

میں اردو نے صوفیا کے تحت بہت جلد مقبولیت حاصل کرلی اور عوام میں رابطہ کی زبان بن گئی۔

محمد تغلق نے جب دولت آباد کو پایہ ، تخت بنایا تو اہلِ دہلی کو ترک وطن کا حکم دیا۔ شمالی ہند کی اردو بھی دہلی سے ترک وطن کرنے والوں کے ساتھ دکن آئی اور دہلی کے شعراء ، علماء ، فضلا منتشر ہوگئے۔ دہلی کا علم شمال سے جنوب میں پھیل گیا۔

دکن میں بہمنی سلطنت قائم ہوئی تو نظم و نسق خاص طور پر مال گذاری کی اصطلاحات میں فارسی اور ترکی کا داخل ہوا لیکن دکنی اردو کے شاعروں کی سرپرستی بھی ہونے لگی۔ بہمنی سلطنت کے ٹوٹنے پر عادل شاہی اور قطب شاہی بادشاہوں نے سرکاری زبان تو فارسی ہی رکھی لیکن دکنی اردو کے شاعروں کی خاص طور پر بہت زیادہ ہمت افزائی اور سرپرستی کی۔ قطب شاہی دور میں یہ " دکنی " کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس دور کے شاعر وجہی ، غواصی ، ابنِ نشاطی ، اور عادل شاہی دور کے نصرتی اور ہاشمی اعلیٰ پائے کے شاعر گزرے ہیں۔ صوفی خانقاہوں میں بھی اس زبان کی تصنیف و تالیف ہوتی رہی۔ آج بھی ان شعراء کا کلام ہندوستانی کالجوں میں یونیورسٹیوں میں اردو اعلیٰ تعلیم کا لازمی جز ہے۔ غرض بہمنی شاہوں ، عادل شاہوں اور قطب شاہوں نے اس زبان کو اس قدر ترقی دی کہ اس میں ہر مطلب کے ادا کرنے کی صلاحیت فصاحت اور بلاغت پیدا ہوچکی تھی۔ مثنویاں ، مرثیے ، غزلیں اور مختلف فارسی کے اصناف سخن دکنی میں رائج ہوئے اور ہندوی اصناف دوہے کبت چوپائیاں اور گیت بھی دکھنی میں لکھے جاتے رہے۔

اسی طرح بیجاپور ، گولکنڈہ اور حیدرآباد اردو زبان و ادب کے بہت بڑے مرکز بن چکے تھے۔ قطب شاہوں کے دور میں تلنگی زبان کے ساتھ اردو

خوب پھلی پھولی ۔ خود بادشاہ قلی قطب شاہ دکنی اردو میں شعر کہتے تھے اور پہلے صاحبِ دیوان بادشاہ تھے ۔ تلنگی شاعروں کے ساتھ اردو شاعروں کی بھی انھوں نے قدردانی اور سرپرستی کی ۔ محمود، فیروز اور احمد گجراتی کا نام دکنی کے اولین شاعروں میں ہوتا ہے ۔

رفتہ رفتہ دکنی نے وہ لہجہ اپنایا جو شمال والوں کے لیے بھی عام فہم تھا خاص طور پر ولی دکھنی اور سراج اورنگ آبادی موجودہ اردو شاعری کے پیش رو شاعر سمجھے جاتے ہیں ۔ ان کا کلام جب دہلی پہنچا تو وہاں کے شاعروں کی آنکھیں کھلیں ورنہ دہلی کے شاعر دکنی اردو کو گری پڑی اور صرف بول چال کی زبان سمجھتے تھے ۔ کیوں کہ اس وقت تک فارسی شعر و ادب کی زبان تھی ۔ ولی اور سراج کی وجہ سے دہلی میں اردو کو ادبی زبان کا درجہ ملا ۔ جب شمال میں محسوس کیا گیا کہ یہ زبان تو دکن میں شعر و ادب کے اظہار کی زبان بن چکی ہے تب دہلی میں اس زبان کو اپنایا گیا ۔

دکن میں جب آصف جاہی سلطنت قائم ہوئی تو آصف جاہ اول نواب قمرالدین کو نہ صرف یہ کہ عادل شاہی اور قطب شاہی روایات، تہذیب و تمدن ورثے میں ملے بلکہ علم پروری اور علم نوازی بھی ان کے حصے میں آئی ۔ وہ صاحبِ "سیف و قلم" کہلاتے تھے ۔

نواب میر نظام علی خان آصف جاہ ثانی کی علمی قدردانیوں نے یہاں کے ادبی ماحول کا رنگ روپ اور بھی نکھار دیا ۔ میر محمد علی خاں صلابت جنگ نے بھی اردو کی ترقی میں بہت کوشش کی ۔ آصف جاہ ثالث نواب سکندر جاہ کا عہد باوجود سیاسی افراتفری کے علمی ادبی میدان میں ترقی کرتا رہا ۔ خصوصاً تاریخ نگاری اس دور میں بہت مقبول ہوئی ۔ نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع کے عہد میں

لکھنو کے دانشور، شعراء اور ادیب ایک ایک کر کے حیدر آباد آنے لگے اور اردو شاعری کا بول بالا ہونے لگا۔ مہاراجہ چندو لال شاداں، مہاراجہ کشن پرشاد کے نانا، اسی زمانے کے شاعر تھے۔ اس دور میں اردو نثر نگاری کو بھی فروغ ہوا۔

علاوہ مختلف کتابوں کے ترجموں کے طب (Medicine) اور انجینیرنگ کی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے۔ دکنی زبان کے محاورے بھی کئی معیاری اردو میں منتقل ہونے لگے۔ اردو زبان میں فصاحت کے ساتھ تکلف پیدا ہوا کیوں کہ دہلی اور لکھنو سے آنے والے شعراء کی زبان میں تکلف شامل تھا۔ کلام میں تصوف کے رنگ کے ساتھ عشقیہ رنگ بھی بڑھنے لگا۔

آصف جاہ خامس نواب افضل الدولہ کے دورِ حکومت میں تاریخ، فلسفہ، ریاضی، کیمیا، طبعیات سارے فنون اردو نثر میں منتقل ہوئے۔ ان کے علاوہ ادبی اور علمی بے شمار کتابوں کے ترجمے کیے گئے اور اردو ادب کا خزانہ کئی علوم و فنون سے مالا مال ہونے لگا۔

آصف سادس میر محبوب علی خاں کے زمانے میں اردو نے ہر میدان میں ترقی کی۔ نظم اور نثر میں ترقی کے لیے باب کھلے، شمالی ہند سے آنے والے شاعر اور ادیبوں نے علم پرَور اور ادب نواز بادشاہ کی سرپرستی میں اپنے خونِ جگر سے شاعری کو سینچا۔ داغ، امیر مینائی اور بعد میں جلیل مانک پوری بادشاہ کے شاہی دربار سے وابستہ رہے۔ داغ کو استادِ شاہ ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ میر محبوب علی خاں کو نظم و نثر دونوں پر عبور حاصل تھا۔ آصف تخلص کرتے تھے اور اردو کے پُرگو شاعر تھے۔

ویسے تو سبھی سلاطینِ آصف جاہی کو شعروشاعری کا شوق و ذوق تھا اور فارسی میں شعر کہتے تھے لیکن میر محبوب علی خاں نے فارسی کے ساتھ اردو میں

بھی شاعری کے اچھے نمونے چھوڑے ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد شاد، خان خاناں آصفی، علی حیدر نظم طباطبائی، شیفتہ، ظہیر دہلوی، حبیب کنتوری آپ کے دربار سے وابستہ تھے۔ نثر نگاروں میں رتن ناتھ سرشار، محسن الملک، عبدالحلیم شرر، شبلی نعمانی، عزیز جنگ ولا، نذیر احمد، مانک راؤ وٹھل راؤ، مولوی چراغ علی، انوار اللہ خاں انوار، اس عہد کے چند مشاہیر تھے۔

۔ سلسلہ ۔ آصفیہ ۔ کے نام سے مشرقی اور مغربی علوم کی کتابوں سے ترجمے کیے گئے۔ علمی اداروں اور انجمنوں کی سرپرستی کی گئی۔ اخبار اور رسائل جاری ہوئے۔ "انجمن ترقی اردو" کا قیام اسی دور میں ہوا تعلیمی مدارس کھلے۔ محبوبیہ گرلز اسکول لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اسی زمانے میں قائم ہوا۔

میر محبوب علی خاں کے زمانے میں ایک انقلابی قدم اٹھایا گیا کہ اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا اور دفاتر کی زبان کو فارسی کے بجائے اردو قرار دیا جس کی وجہ سے اردو کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ اس کے بعد یہ عدالتوں میں پہنچی اور عدالتوں کی زبان بنی۔

آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں کا عہد اردو زبان کا زرین دور کہلاتا ہے۔ شعر گوئی اور نثر نگاری کا چلن اس دور میں عام ہوگیا۔ خود بادشاہ شعر کہتے اور عثمان تخلص کرتے تھے۔ جلیل مانک پوری فصاحت جنگ کو آپ کے دور میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اور استاد شاہ کہلائے۔

آصف سابع کا سب سے بڑا کارنامہ جامعہ ۔ عثمانیہ کو وجود میں لانا تھا۔ جامعہ ۔ عثمانیہ کی داغ بیل ڈال کر اس دور کا آغاز کیا جسے اردو کا زرین دور کہا جاتا ہے۔ ریاست کے ہر طبقے میں اس کا فیض عام ہوا جب کہ کسی اور ریاست میں ایسا نہیں ہوا تھا۔

اردو ہماری پرانی اور نئی تہذیب کے ملن کی نشانی ہے ۔ باوجود مختلف رکاوٹوں کے حیدرآباد کی سماجی اور تہذیبی زبان اردو ہی رہی اور اپنی دل نوازی سے آج بھی دلوں کو گرماتی چلی ہے ۔

○●○

اردو صحافت ۔ ایک مختصر جائزہ

حیدرآباد میں چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد دورِ آصفی میں جو رسائل نکلے وہ علم و ادب کی ترقی میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے ۔

عہد آصفی کے اخبار اور رسائل صرف خبرنامے ہی نہیں تھے بلکہ قومی تحریکوں اور تنظیموں کی روداد کے حامل بھی ہوتے تھے جہاں زندگی کی عکاسی ہوتی تھی ۔ یہ اخبار اور اردو رسائل کچھ روزنامے ہوتے کچھ ہفت روزہ یا پندرہ روزہ، کچھ ماہ نامے تو کچھ سہ ماہی ۔ ماہ وار رسالے مضامین، تنقید تبصرے، نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہوتے ۔ سیر و سیاحت ، اخلاقیات اور تہذیب و تمدن کی باتیں بھی ہوتیں ۔

مولوی سید علی بلگرامی جیسے عالم و فاضل زبان دان کی نگرانی میں ایک سرِ رشتہ "علوم و فنون" کے نام سے قائم ہوا جس میں شائع شدہ اردو کتابوں کو "سلسلہ آصفیہ" کے نام سے موسوم کیا گیا ۔

انگریزی، فرانسیسی اور عربی زبان کی کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ۔ اس وقت سے ہی حیدرآباد میں اخبار و رسائل نکلنے لگے اور ایک ادبی ماحول پیدا ہو گیا ۔ ۱۸۵۹ء سے باقاعدہ کئی رسالے نکلنے شروع ہوئے ۔ خواتین کے لیے بھی معیاری رسائل نکلنے لگے جو تحریکِ نسواں کی ترجمانی کرتے تھے ۔

بچوں کے لیے بھی دلچسپ اور کارآمد موضوعات پر مضامین اور کہانیاں لکھی جانے لگیں ۔ یہ رسالے بچوں میں بہت مقبول ہوئے ۔

حیدرآباد میں صحافت ہمیشہ آزاد رہی ۔ تعلیم کے دروازے کھل جانے کی وجہ سے سماج کے اخلاقی اور تہذیبی قدروں میں ان اخبارات اور رسائل کی وجہ سے گراں قدر اضافہ ہوا ۔

○●○

حیدرآباد کے تاریخی آثار اور عمارتیں

ریاست حیدرآباد کا صدر مقام شہر حیدرآباد ایک تہذیبی اور تعلیمی مرکز ہونے کے علاوہ ایک خوب صورت شہر بھی رہا ہے ۔ اس کے گوشے گوشے میں تاریخ چھپی ہے ۔ شہر کی تاریخی عمارتیں ماضی کے مختلف ادوار کی یاد دلاتی ہیں ۔

قطب شاہی سلطنت کا پایہ ، تخت گولکنڈہ تھا ۔ اس کے پانچویں حکمراں محمد قلی قطب شاہ جو شاعر بھی تھا اور تعمیر کا بھی نفیس ذوق رکھتا تھا ، گولکنڈے سے ۵ میل کے فاصلے پر شہر حیدرآباد کو بسایا ۔ اس کا باقاعدہ نقشہ تیار کیا گیا ۔ بھاگ متی کے دیس چچلم کے پُر فضا مقام پر " چار مینار " کی تعمیر ہوئی جس کے سامنے چار کمانیں چاروں سمت بنائی گئیں ۔ مچھلی کمان ، کالی کمان ، سحر باطل یا شیر دل کی کمان اور چار کمان ۔ جن سے شہر کے چاروں سمت سڑکیں نکلتی تھیں ۔ ان کے بیچ میں " گلزار حوض بنایا گیا جو پہلے چار سُو کا حوض یا سو کھا حوض کہلاتا تھا ۔

گلزار حوض کے جنوب کی طرف سلطان محمد ، محمد قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور داماد نے " مکہ مسجد " کی بنیاد رکھی ۔ اس کے ایک حصے میں آصف جاہی

بادشاہ میر محبوب علی خاں اور ان کے افرادِ خاندان کے مزار نظر آتے ہیں۔

محلات : چارمینار کے سامنے شمال مغرب کے رخ پر قطب شاہیوں کے کئی محلات تھے جن کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ان میں سے بعض کے نام آج بھی اپنی بستیوں کی وجہ سے باقی ہیں۔ مثلاً خُداداد محل، مشک محل، گگن محل، چندر محل، چندن محل، حنا محل، ندی محل، سجن محل، جو بادشاہ کی رہائش گاہیں تھیں۔

بازار : بازاروں کی ترتیب بھی خاص طرح سے رکھی گئی تھی۔ ان کے نام بھی دلچسپ تھے۔ جیسے لاڈ بازار، ریْن بازار، چوڑی بازار، بیگم بازار، ترپ بازار، سدی عنبر بازار، عیدی بازار، روپ لال کا بازار، جہاں دار جاہ بازار، سدی عنبر بازار سے متصل افضل گنج ہے جہاں استاذِ شاہ فصیح الملک داغ نے قیام کیا تھا۔

محلّے : جو راستہ موجودہ حسینی علم سے گولکنڈہ جاتا تھا وہاں باہر سے آنے والوں کے لیے کاروان سرائے بنائی گئی تھی۔ اب اس محلّے کا نام ہی " کاروان " ہے۔ کاروان میں ایک ٹولی مسجد اور اس کے قریب جھام سنگھ کا مندر ہے۔

بزرگ شاہ علی کے نام پر شاہ علی بنڈہ محلہ مشہور ہے۔ سلطان شاہی محلے میں خدیجہ بیگم کی مسجد ہے جو قطب شاہی مسجد کہلاتی ہے۔ یہاں قدیم اور بہت سے مساجد ہیں۔ ایک محلہ دار الشفاء ہے جہاں شفاخانہ قائم تھا۔

گلیاں : اسی طرح کے ناموں میں جام باغ کی گلی، فصیح جنگ کی گلی، جوہری گلی، ایرانی گلی، گولہ گلی، موتی گلی، جیسے نام گزشتہ کاروبار کی یاد دلاتی ہیں۔

آخری قطب شاہ سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے زمانے کی یادگار گوشہ محل کی بارہ دری اب بھی باقی ہے جو ایک گنجان محلّے میں تبدیل ہوگیا ہے۔ مہاراجہ چندو لال کی بارہ دری بھی مشہور ہے۔

مساجد : شہر میں کئی مساجد ،عاشور خانے ،لنگر خانے ،دواخانے ، سرائے محل اور مندر وغیرہ قطب شاہی دور کی یادگار ہیں ۔ ان میں سے چند مساجد کے نام یہ ہیں : مسجدِ شمع رخ ، مسجدِ گلاب رخ ،مسجد باغِ جہاں آرا ، مسجدِ غسالاں اور مسجدِ میاں مشک ، وغیرہ ۔

دروازے : شہر کے اطراف پہلے فصیل نہیں تھی بعد میں ایک فصیل بنائی گئی جس کے بارہ دروازے اور بارہ کھڑکیاں مشہور تھیں ۔ آج بھی دلی دروازہ ، علی آباد کا دروازہ ، چھپا دروازہ ، دبیر پورے کا دروازہ ، فتح دروازہ ، چادر گھاٹ کا دروازہ ، لال دروازہ ، اور دودھ باؤلی کا دروازہ ، مشہور ہیں جن کے اطراف بستیاں اسی نام سے منسوب ہیں ۔

کھڑکیاں : کھڑکیوں میں رنگیلی کھڑکی یا رنگ علی شاہ کی کھڑکی ، بھنوروں کی کھڑکی ، ماتا کھڑکی ، بود علی شاہ کی کھڑکی ، عوام میں مشہور ہیں ۔ ان کے علاوہ بھی چند دروازے اور کھڑکیاں تھیں جو بند کردی گئیں ۔

پُل : شہر جب پھیلتا گیا تو موسیٰ ندی پر چار پُل بنائے گئے ۔ پرانا پُل ، مسلم جنگ کا پُل ، نیا پُل اور چادر گھاٹ کا پُل ۔ بعد میں اس ندی پر ایک اور پُل بنایا گیا جو سالار جنگ کا پُل کہلاتا ہے ۔ قریب ہی سالار جنگ میوزیم ہے جس کی وجہ سے پُل کو یہ نام دیا گیا ہے ۔

رفتہ رفتہ جب یہ شہر موسیٰ ندی کے شمالی کنارے پر پھیلنے لگا جس کی سرحد چھاؤنی حسین ساگر تک پہنچ گئی ۔ حسین ساگر کا بند یا کٹہ پار کرنے کے بعد سکندر آباد شروع ہوتا ہے ۔ حیدر آباد اور سکندر آباد توام شہر کہلاتے ہیں یعنی Twin Cities آصف جاہ ثالث نواب سکندر جاہ کے زمانے میں یہ شہر سکندر آباد کے نام سے مشہور ہوا ۔

سکندر آباد فوجی علاقہ تھا ۔ یہاں عموماً بیرونی افراد اور تاجر آکر بس گئے تھے ۔ اس لیے باوجود پاس پاس ہونے کے ان دونوں مقاموں کی تہذیب اور رہن سہن میں نمایاں فرق نظر آتا ہے ۔ یہاں زیادہ تر پارسی ، اینگلو انڈین ، ٹامل اور ملیالی افراد کی آبادی تھی ۔

رانی گنج اور قیصر گنج ، ملکہ ، وکٹوریہ کے ہندوستان کی ملکہ بننے کے بعد وقوع میں آئے جو رانی کہلاتی تھیں ۔

آصف جاہوں نے جب حیدر آباد کو اپنا تخت بنایا تو نئے سرے سے اس کی آرائش و زیبائش ہوئی اور کئی محلات اور عمارتیں تعمیر ہوئیں ۔ شاہی عمارتوں میں پنج محلہ ، چو محلہ اور خلوت (جس سے پورے محلے کا نام خلوت مشہور ہوگیا) کنگ کوٹھی اور پرانی حویلی اور سکریٹریٹ کے محلات محبوب منشن شامل ہیں ۔

چو محلہ تقریباً ۱۰۰ سال تک آصفی حکمران یہاں مقیم رہے ۔ ۱۷۶۱ء میں آصف جاہ ثانی میر نظام علی خاں نے حیدر آباد کو اپنا دارالسلطنت بنایا تو جِلا محل کو اپنی رہائش کے لیے منتخب کیا اور چومحلہ سے موسوم کیا ۔

قطب شاہی دور میں چومحلہ کے مقام پر جِلا محل کے نام سے ایک عالی شان محل تھا ۔ اسس کے ساتھ کئی جدید عمارتیں بنوائیں مثلاً خلوت ، خواب گاہ اور دیوان بارِ عام وغیرہ ۔ چوں کہ یہ چار محل تھے اس لیے چومحلہ کے نام سے موسوم ہوئے پھر جلوخانہ اور نقارخانہ کے نام سے دو عمارتیں بنیں اور چمن بندی کی گئی ۔ باغ لگائے گئے اور دو محل اور تیار ہوئے ۔

نواب سکندر جاہ ، ناصرالدولہ ، افضل الدولہ ، محبوب علی خاں اور عثمان علی خاں کے زمانے میں اس محل کے احاطے میں جلو خانہ ، رنگ محل روشن بنگلہ ، افضل محل ، آفتاب محل ، مہتاب محل ، تہنیت محل تعمیر ہوئے اس کے علاوہ

چاندنی بیگم کی حویلی ، بخشی بیگم کی حویلی ، منجھلی بیگم کی حویلی ، موتی بنگلہ ، بھنتی بنگلہ ، شادی خانہ ، توشک خانہ ، بیچ محلہ ، محل کل پیراں اور راگ مالا بنائے گئے ۔

آصف جاہ ثانی میر نظام علی خاں ، سکندر جاہ ، افضل الدولہ اور میر محبوب علی خاں چو محلہ میں رہا کرتے تھے ۔ محبوب علی خاں کا قیام اکثر پرانی حویلی میں بھی ہوتا تھا ۔ دربارِ عام اور دربارِ خاص اور خطابات کی سرفرازی اور عیدوں کے موقعوں پر چو محلہ استعمال ہوتا تھا اور شاہی دعوتیں دی جاتی تھیں ۔

پرانی حویلی ۔ قطب شاہی دور میں یہ قطب شاہی پیشوا حضرت میر مومن کا محل تھا بعد میں آصف جاہی حکمرانوں کا شاہی محل قرار پایا ۔ نواب سکندر جاہ ، افضل الدولہ اور ناصر الدولہ اپنے ولی عہدی کے زمانے میں یہیں رہتے تھے ۔ میر محبوب علی خاں اور میر عثمان علی خاں اسی حویلی میں پیدا ہوئے اور ولی عہد مقرر ہوئے ۔

کنگ کوٹھی ۔ ولی عہد بننے کے بعد عثمان علی خاں کی رہائش کے لیے اس کوٹھی کا انتظام ہوا اور اس کوٹھی میں انھوں نے آخری سانس لی ۔ یہ کوٹھی نواب کمال خاں الملقب کمال یار جنگ کی کوٹھی تھی جسے محبوب علی خاں نے خرید لیا تھا ۔ تمام شیشہ جات اور سامانِ آرائش پر K.K لکھا ہوا تھا ۔ اسی مناسبت سے کنگ کوٹھی ، کا نام تجویز پایا ۔

فلک نما پیلس ۔ وقار الملک نواب اقبال الدولہ نے اسے تعمیر کروایا تھا بعد میں میر محبوب علی خاں نے اسے خرید لیا اور ازسرِ نو اس کی زیبائش کی ۔ قیمتی جواہرات اور نوادرات بھی یہاں رکھے تھے ۔ پرنس آف ویلز اور وائسرائے ہند یہاں بہ طور مہمان ٹھہرائے جاتے تھے ۔

ملدی باغ ۔ نواب مکرم الدولہ اور بہرام الدولہ کی رہائش گاہ تھی ۔ مکرم الدولہ کے انتقال پر نواب میر محبوب علی خاں نے اسے لینے کی خواہش ظاہر کی تو یہ

عمارت انھیں نذر کردی گئی۔ اس لیے یہ نذری باغ کہلاتی ہے۔

رزیڈنسی : برطانوی رزیڈنٹس کے لیے مقرر تھی۔ رزیڈنسی روڈ اور رزیڈنسی بازار، رزیڈنٹس کے رہنے کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ میر عثمان علی خاں کی تخت نشینی کے بعد "شاہ راہِ عثمانی" اور سلطان بازار" کہلانے لگے۔ اسی عمارت میں اب لڑکیوں کا کالج ہے اور سلطان بازار بڑا شاپنگ سنٹر بن چکا ہے۔

باغِ عامہ : آصفی دور میں جہاں "بالکش کا باغ" تھا مختارالملک کی تجویز پر وہاں ایک باغ عامہ کا انتظام کیا گیا۔ چمن بندی کی گئی۔ میووں اور پھلوں کے درخت لگائے گئے۔ جھولے ڈالے گئے۔ ایک Zoo کا اہتمام بھی کیا گیا جس میں جانور رکھے گئے۔ پرندوں کو بھی جگہ دی گئی۔

میر عثمان علی خاں نے رفاہِ عام کے لیے شہر کو بہت ترقی دی۔ موسیٰ ندی کے کنارے عدالت العالیہ، دواخانہ عثمانیہ، یونانی دواخانہ (جو شفاخانہ نظامیہ کہلاتا ہے)، سٹی کالج، چادر گھاٹ کالج، حزا خانہ، زہرا، امین باغ (جہاں زنانہ دواخانہ بنوایا گیا) اور کتب خانہ آصفیہ وجود میں آئے۔ معظم جاہی مارکٹ، جوبلی ہال، ٹاؤن ہال، جاگیردار کالج، نظام کلب اور نظام کالج بھی ان ہی کے دور میں تعمیر ہوئے۔

کتب خانہ، آصفیہ : کتب خانہ، آصفیہ میں مشرقی مخطوطات کا انمول ذخیرہ ہے جہاں عالی مرتبت سلاطین کی تحریریں موجود ہیں۔ اس کتب خانے کو نواب میر محبوب علی خاں نے نواب عمادالملک بہادر کی تجویز پر قائم کیا تھا جو پہلے شاہی کتب خانے کے نام سے جانا جاتا تھا اور عابد روڈ پر واقع تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اسے موسیٰ ندی کے کنارے پر دو منزلہ عمارت میں منتقل کردیا گیا۔ اس عمارت کی افتتاح عثمان علی خاں نے کی تھی۔

دوسرے کتب خانے جو شہر حیدرآباد کی عوام کے لیے دور عثمانی میں

قائم کیے گئے وہ ہیں کتب خانہ سید علی بلگرامی، کتب خانہ محب حسین، کتب خانہ چراغ علی، کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ سید محمد قاسم، کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو، کتب خانہ انجمن ترقی اردو اور کتب خانہ عمر یافعی۔

دواخانہ عثمانیہ : شہریوں کے علاجِ معالجے کے لیے جدید آلات سے لیس موسیٰ ندی کی بائیں جانب اور سٹی کالج کے مقابل خوب صورت عمارت ہے اور مسلم آرٹ کا نمونہ ہے۔

اس سے ملحق طبیہ کالج کی پرانی عمارت ہے جو ناصرالدولہ کے عہد میں تعمیر کی گئی تھی۔

سٹی کالج : نوجوانانِ حیدرآباد کی تعلیم کے لیے شہر کے بیچ میں بنوائی گئی جس کے روبرو موسیٰ ندی بہتی ہے۔

جاگیر دار کالج : میر عثمان علی خاں نے اپنے امراء کے لڑکوں کے لیے ایک علٰحدہ کالج معہ ہاسٹل قائم کیا جو بیگم پیٹ میں ایک عالی شان عمارت میں تھا۔ یہاں لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ تربیت بھی دی جاتی تھی۔ آج یہاں حیدرآباد پبلک اسکول قائم ہے۔

عدالت العالیہ : آصف سابع کے عہد میں ریاست کے انتظامِ عدالت نے جو ترقی کی تھی اس کی زندہ مثال ہے۔ موسیٰ ندی کے دائیں جانب ہندی عربی طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس رفیع الشان عمارت کو ۱۹۱۹ء میں سنگِ گرانٹ سے بنوایا گیا تھا۔

معظم جاہی مارکٹ : حیدرآباد کی سب سے بڑی اس مارکٹ کی بنیاد عثمان علی خاں کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔

○●○

کتاب کے بارے میں...............

طیبہ بیگم حیدر آباد کے اس علم دوست اور مشہور بلگرامی خاندان کی چشم و چراغ ہیں جنھوں نے دو صدیوں سے حیدر آباد دکن کی علمی، سیاسی اور سماجی زندگی پر اپنے نقش ثبت کیے۔ ان کی والدہ سکینہ بیگم صاحبہ مرحومہ ایک صاحبِ طرز ادیبہ تھیں جنھوں نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی ترقی اور توسیع میں حصہ لیا تھا۔ نانی طیبہ بیگم خدیو جنگ اردو کے اوّلین خاتون ناول نگاروں میں تھیں جن کے ناول مسلم معاشرے کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

طیبہ نے جس ہستی پر قلم اٹھایا ہے وہ ہندوستان اور بالخصوص ادب کی تاریخ میں اہم مقام کی حامل تھی۔ یہ اور بات ہے کہ تعصب اور سیاست کی آندھیوں نے گوہر صد چراغ کی تابانیوں کو دھندلا دیا۔ آصفِ سابع میر عثمان علی خاں کی ذاتِ والا صفات گوناگوں خوبیوں کی حامل تھی۔ طیبہ بیگم نے آصف سابع کی حیات اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے نہ تنقید کی ہے اور نہ غیر ضروری تحسین بلکہ ان کی زندگی کے حقائق کو منظر عام پر لایا۔ ادھر کچھ عرصہ سے میر عثمان علی خاں پر کتابیں لکھی گئیں لیکن بعض میں صرف ان کے عہد کے نظم و نسق اور حکمرانی کا جائزہ لیا اور اس جائزہ میں ان کی اصل شخصیت کی تصویر اُبھر کر سامنے نہیں آپائی۔ مجھے خوشی ہے کہ قابل مصنفہ نے بڑی تحقیق اور کاوش سے نہ صرف ان کے کارناموں کا جائزہ لیا بلکہ ان کی ذات میں چھپے ہوئے جوہروں کو روشناس کروایا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ تصنیف ادب اور تاریخ پر دونوں میں بہ نظر تحسین دیکھی جائے گی۔

عبدالمحمود

(سکریٹری ایچ دی ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ)

طیبہ بیگم ادب کی دنیا میں نیا نام نہیں ہے۔ ان کے تحریر کردہ افسانے ، مضامین، انشایئے اور خاکے رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان تمام اصنافِ ادب پر انھیں یکساں طور پر خلاقانہ دسترس حاصل ہے۔ طیبہ بیگم کی تین تصانیف جوہی کی ڈالی (بچوں کی کہانی) سرِ مژگاں (افسانے) اور ابرِ نیساں (خاکے) شائع ہو چکی ہیں۔

زیرِ نظر تالیف "آصف سابع میر عثمان علی خاں" اردو میں اپنے موضوع پر غالباً پہلی کتاب ہے جس میں آصف سابع کی حیات اور شخصیت کے علاوہ ان کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالات کو تاریخی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔

آصفِ سابع نواب میر عثمان علی خاں نہایت دور اندیش حکمراں تھے۔ وہ زمانہ کی نبض پہچانتے تھے۔ انھوں نے وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ریاست میں بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ کئی فلاحی اور ترقیاتی کام کیے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مؤرخین اس دور کو آصف جاہی سلطنت کے عہدِ زرّین سے تعبیر کرتے ہیں۔ طیبہ بیگم نے اسی زاویۂ نگاہ سے آصفِ سابع کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا جائزہ لے کر انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ:

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

مجھے امید ہے کہ اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

(ڈاکٹر) مغنی تبسم

(پروفیسر و سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

اقبال اور بچوں کا ادب

مصنفہ: زیب النساء بیگم

صفحات: 216

قیمت: -/60 روپے

اندرا پریہ درشنی

مصنف: الکا شنکر

مترجم: عتیق مظفر پوری

صفحات: 142

قیمت: -/45 روپے

ہندوستان کی بزرگ ہستیاں (حصہ اول)

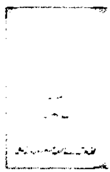

مصنف: صفدر حسین

صفحات: 87

قیمت: -/15 روپے

ہندوستان کی بزرگ ہستیاں (حصہ دوم)

مصنف: صفدر حسین

صفحات: 103

قیمت: -/16 روپے

نسیم کا خواب

مرتب: حفیظ عباسی

صفحات: 124

قیمت: -/20 روپے

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں

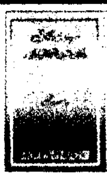

مصنف: راجندر اوستھی

مترجم: منظور عثمانی

صفحات: 78

قیمت: -/21 روپے

ISBN: 978-81-7587-393-3

9788175873933

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025